لیکن چوں کہ ابھی ان کی اس بے وقوفی کا انجام ان کے سامنے نہیں آیا ہے اس وجہ سے موقع ہے کہ یہ کچھ دنوں یہ دانش فروشی اور کر لیں۔

قرآن مجید نے ان لوگوں کا یہ راز بھی یہاں کھول دیا ہے کہ یہ لوگ مسلمانوں کے پاس جب آتے ہیں تو ان پر یہ اثر جمانے کی کوشش کرتے ہیں کہ گویا ان کے اور مسلمانوں کے درمیان سرے سے کوئی تفاوت ہے ہی نہیں لیکن جب یہ اپنی مجلسوں میں جاتے ہیں اور اپنے لیڈروں سے ملتے ہیں تو وہاں مسلمانوں کے سامنے اپنی کہی ہوئی باتوں کی صفائی پیش کرتے ہیں اور ان کو اطمینان دلاتے ہیں کہ ہم تو بدستور آپ کے ساتھ ہیں، مسلمانوں سے جو باتیں ہم کہتے ہیں وہ تو محض ان کو بے وقوف بنانے کے لیے بطور مذاق کہتے ہیں۔

قرآن مجید نے ان کی اس بات کا جواب یہ دیا ہے کہ وہ تو سمجھ رہے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ مذاق کر رہے ہیں حالانکہ مذاق ان کے ساتھ قدرت کر رہی ہے جو ان کی اس سرکشی کے باوجود ان کو ڈھیل پر ڈھیل دیے جا رہی ہے۔ وہ اپنی چالوں میں اپنے آپ کو کامیاب سمجھتے ہوئے آگے بڑھتے جا رہے ہیں اور یہ نہیں سمجھ رہے ہیں کہ ان کا یہ آگے بڑھنا اس ہلاکت کے گڑھے میں گرنے کے لیے آگے بڑھنا ہے جو اس طرح کے لوگوں کے لیے خدا کی طرف سے مقدر ہے لیکن انھیں نظر نہیں آ رہا ہے۔

اس سلسلہ کی آخری بات جو فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ عقل و دانش کے اس ادعا کے باوجود انھوں نے سودا بہت غلط کیا۔ انھوں نے ہدایت کے بدلہ میں ضلالت خریدی اور اس کو بڑا نفع بخش مال سمجھا لیکن یہ مال ان کے لیے نہ آخرت میں نفع بخشنے والا ہے نہ دنیا میں۔ آخرت میں تو اس کی قدر و قیمت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا لیکن دنیا کے بازار میں اگر اس کی مانگ تھی تو نبی آخر الزمان کی بعثت سے وہ بھی ختم ہو گئی۔ اور اب یہ لوگ خسر الدنیا والآخرہ کے مصداق ہیں۔ ان کی یہی ضلالت پسندی ان کے اسلام سے محرومی کا سبب بھی بنی ہے۔

۱۳۔ ایک شبہ کا ازالہ

ان آیات میں قرآن اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ان مخالفوں کے لیے جو لفظ استعمال ہوئے ہیں وہ بظاہر سخت معلوم ہوتے ہیں، ممکن ہے ان کی وجہ سے بعض لوگوں کے ذہن میں یہ شبہ پیدا ہو کہ یہ انداز کلام اس حکمت دعوت کے منافی ہے جس کی نصیحت خود قرآن نے فرمائی ہے۔ قرآن مجید نے خود یہ تعلیم دی ہے کہ اللہ کے رستہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ دعوت دو اور اہل کتاب کے بارے میں تو خاص طور پر اس کی ہدایت ہے کہ ان سے صرف خوب صورت طریقہ ہی سے دین کے معاملہ میں بحث و گفتگو کی جائے۔ پھر یہاں قرآن نے انھی اہل کتاب کے ایک گروہ کے بارے میں سفہاء اور مفسدین اور ان کے اکابر اور لیڈروں کے لیے شیاطین کے الفاظ کیوں استعمال فرمائے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ الفاظ دعوت کے دور میں استعمال نہیں ہوئے ہیں بلکہ یہ اس وقت استعمال ہوئے ہیں جب انھوں نے اپنی مسلسل ہٹ دھرمیوں اور شرارتوں اور اسلام کے خلاف اپنی پیہم ریشہ دوانیوں اور سازشوں سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اب ان کے دلوں پر مہر لگ چکی ہے اور یہ کسی طرح بھی ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ اس مرحلہ میں اگر ان لوگوں کے لیے یہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور مقصود ان کے استعمال سے صرف غصہ اور نفرت کا اظہار نہیں ہے بلکہ بیان واقعہ اور اظہار حقیقت ہے تاکہ دوسرے لوگ جو اپنے دین و ایمان کی سلامتی چاہتے ہیں ان لوگوں کی اصل حقیقت سے آگاہ ہو جائیں کہ آسمانی ہدایت کے ان قدیم وارثوں کا انحطاط اب کس درجہ تک پہنچ چکا ہے اور جن کو خدا نے اپنی زمین کی اصلاح کے کام پر مامور کیا تھا اب وہ اس میں کیا کیا فساد مچا رہے ہیں۔

یہ سورہ بقرہ، جس میں یہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں، بنی اسرائیل کے لیے صرف دعوت کی سورہ نہیں بلکہ ان کے لیے ملامت کی سورہ بھی ہے۔ اس میں ان کے ان جرائم کی فہرست پوری تفصیل کے ساتھ پیش کی گئی ہے جو انھوں نے خدا کی شریعت اور اس کے نبیوں اور رسولوں کے خلاف کیے ہیں اور جن کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے ان کو اس بات کا مستحق قرار دیا ہے کہ وہ قوموں کی امامت کے منصب سے ہٹائے جائیں اور ان کی جگہ ایک دوسری امت اس منصب پر سرفراز کی جائے۔ یہ فیصلہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر اچھی طرح اتمام حجت کر چکنے کے بعد فرمایا ہے اور اس کے وجوہ اور دلائل آگے اس سورہ میں بیان ہوں گے۔ اس وجہ سے یہ بات عین اس سورہ کے مزاج کے مطابق ہے کہ اس میں بنی اسرائیل کے حقیقی چہرے سے نقاب اٹھا دی جائے تاکہ جن لوگوں پر ان کے مذہبی تقدس کا ایک رعب تھا اور جس سے یہ لوگ اسلام کے خلاف پراپیگنڈا کرنے میں فائدہ اٹھا رہے تھے وہ ختم ہو جائے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے بھی یہود کے علما اور لیڈروں کے لیے جو سخت الفاظ استعمال فرمائے ہیں وہ بھی اس طرح کے اتمام حجت کے بعد استعمال فرمائے ہیں۔ حضرت مسیح کے یہ الفاظ انجیلوں میں موجود ہیں۔ اگر قرآن کے الفاظ سے ان کا موازنہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ قرآن کے الفاظ بہت ہی نرم ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے تو ان کے لیے "سانپ کے بچوں" اور "سفیدی پھری ہوئی قبروں تک" کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔

۱۴۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۱۷-۲۰

اس کے بعد قرآن نے مذکورہ دونوں مخالف اسلام گروہوں کی ایک ایک تمثیل بیان کی ہے۔ پہلی تمثیل مقدم الذکر مختوم القلوب گروہ کی ہے جو اپنی فطرت کو اس قدر مسخ کر چکا ہے اور اسلام کی مخالفت میں اس قدر آگے جا چکا ہے کہ اب اس کے لیے اسلام قبول کرنے کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہا ہے۔

دوسری تمثیل اس موخر الذکر گروہ کی ہے جو اسلام کی علانیہ مخالفت کے بجائے اس کے خلاف چالیں

چل رہا ہے اور ایک نہایت واضح حقیقت کا، جس کا حق ہونا خود اس پر بھی واضح ہے، نہایت اوچھی تدبیروں سے مقابلہ کرنا چاہتا ہے۔

پہلے ان دونوں تمثیلوں کو، قرآن کے حکیمانہ الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے، اس کے بعد ہم اپنے الفاظ میں ان کی وضاحت کریں گے۔ فرمایا،

آیات ۱۷-۲۰

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لَا يُبْصِرُونَ ﴿١٧﴾ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ﴿١٨﴾ أَوْ كَصَيِّبٍ مِنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمَاتٌ وَرَعْدٌ وَبَرْقٌ ۚ يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِمْ مِنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ۚ وَاللَّهُ مُحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ ﴿١٩﴾ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ ۖ كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُمْ مَشَوْا فِيهِ وَإِذَا أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٢٠﴾ ع

ترجمۂ آیات ۱۷-۲۰

ان لوگوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے لوگوں کے لیے آگ جلائی، جب آگ نے اس کے اردگرد کو روشن کر دیا تو اللہ نے ان کی روشنی سلب کر لی اور ان کو ایسی تاریکی میں چھوڑ دیا جس میں ان کو کچھ سجھائی نہیں دے رہا ہے۔ یہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، اب یہ لوٹنے والے نہیں ہیں۔ ۱۷-۱۸

یا ایسی ہے جیسے آسمان سے بارش ہو رہی ہو، اس میں تاریکی ہو، کڑک ہو اور چمک ہو۔ یہ کڑکے کی وجہ سے موت کے ڈر سے اپنے کانوں میں اپنی انگلیاں ٹھونسے لے رہے ہوں۔ حالانکہ اللہ کافروں کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے ہے۔ بجلی کی چمک ان کی آنکھوں کو

خیرہ کیے دے رہی ہو جب جب چمک جاتی ہو یہ چل پڑتے ہوں اور جب ان پر اندھیرا چھا جاتا ہو رک جاتے ہوں۔ اگر اللہ چاہتا تو ان کے کان اور آنکھوں کو سلب کر لیتا، اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۱۹-۲۰

۱۵- الفاظ کی تحقیق

'صیّب' کا مفہوم

صَیِّب کا لفظ سخت بارش کے لیے بھی آتا ہے اور زور کے ساتھ برسنے والے بادل کے لیے بھی۔ ہم نے اپنے ترجمہ میں پہلے معنی کو ترجیح دی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس تمثیل میں، جیسا کہ آگے واضح ہوگا، اس لفظ سے اشارہ قرآن مجید کی طرف ہے اور قرآن کو خود قرآن میں بارش سے جگہ جگہ تشبیہ دی گئی ہے۔

'سماء' کا مفہوم

سَمَاء کا لفظ عام طور پر تو اس سقفِ نیلگوں کے لیے بولا جاتا ہے جس کو ہم آسمان کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ ابر کے معنی میں بھی آیا ہے اور اس فضائے بسیط و عریض کے لیے بھی جو ہمارے سروں پر ہے۔

بارش اگرچہ آسمان ہی سے ہوتی ہے اس وجہ سے اس کے ساتھ لفظ سماء کا اضافہ بظاہر کچھ غیر ضروری سا معلوم ہوتا ہے لیکن اس اضافہ سے ایک تو بارش کی تصویر نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے اور اس تصویر کی کسی تمثیل میں بڑی اہمیت ہوا کرتی ہے۔ دوسرے اس سے قرآن مجید کے آسمانی ہونے کی طرف ایک لطیف اشارہ ہو رہا ہے کیوں کہ مراد اس بارش سے قرآن ہی ہے جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا۔

'صواعق' کا مفہوم

صواعق، صاعقہ کی جمع ہے۔ اس کے معنی گرج اور کڑک کے بھی ہیں اور اس بجلی کے لیے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے جو کڑک کے ساتھ گرتی ہے۔

۱۶- دونوں تمثیلوں کی وضاحت

تمثیل سے متعلق ایک اصولی حقیقت

ان دونوں تمثیلوں کی وضاحت سے پہلے نفس تمثیل سے متعلق ایک اصولی حقیقت کا ذہن نشین کر لینا ضروری ہے۔

وہ یہ کہ تمثیل اگرچہ تشبیہ ہی کی نوعیت کی ایک چیز ہے لیکن تشبیہ اور تمثیل میں بڑا فرق ہے۔ ایک عام تشبیہ میں اصلی نگاہ مشبہ اور مشبہ بہ پر ہوتی ہے۔ ان دونوں کے اجزا کو الگ الگ ایک دوسرے کے مقابل میں رکھ کے دیکھا جاتا ہے کہ ان میں باہم دگر کتنی مشابہت و مطابقت پائی جاتی ہے اور پھر اسی مطابقت و مشابہت کے لحاظ سے اس تشبیہ کا حسن و قبح متعین ہوتا ہے لیکن تمثیل میں اجزا کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہوتی بلکہ اس میں صورتِ واقعہ کو صورتِ واقعہ سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ اگر ایک

صورتِ حال اور دوسری صورتِ حال میں پوری پوری مطابقت موجود ہے اور تمثیل صورتِ حال کی پوری تصویر نگاہوں کے سامنے پیش کر رہی ہے تو وہ تمثیل مکمل ہے، اگرچہ تشبیہ کے وہ تمام ضوابط اس پر منطبق نہ ہو رہے ہوں جو ایک تشبیہ کے مکمل ہونے کے لیے اہلِ فن نے ضروری قرار دیے ہیں۔

اس تمہید کے بعد اب پہلی تمثیل کو لیجیے۔

پہلی تمثیل اور اس کا مصداق

یہ تمثیل ایک ایسے شخص کی تمثیل ہے جس نے اندھیری رات میں لوگوں کو روشنی دکھانے کے لیے آگ جلائی۔ اس نے یہ کام بڑی محنت اور بڑے اہتمام کے ساتھ کیا یہاں تک کہ اس کا تمام گرد و پیش منور ہو گیا۔ لیکن جن لوگوں کے لیے اس نے یہ محنت برداشت کی انھوں نے اس روشنی کی کوئی قدر نہیں کی، ان کی اس ناقدری کی سزا اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ دی کہ ان کی روشنی سلب کر لی اور ان کو ایک ایسے گھٹا ٹوپ اندھیرے کے اندر چھوڑ دیا جہاں ہاتھ کو ہاتھ بھی سجھائی نہیں دے رہا ہے۔ پھر اس اندھیرے کے اوپر مزید غضب یہ ہے کہ یہ لوگ بہرے، گونگے اور اندھے بھی ہیں اور یہ تمام اوصاف ان کے اندر بیک وقت موجود ہیں[1] اس وجہ سے نہ تو کسی پکارنے والے کی پکار سن سکتے ہیں، نہ اس کی پکار کا جواب دے سکتے ہیں اور نہ کسی نشان یا علامت یا اشارہ سے کوئی رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔ اس وجہ سے اس بات کا کوئی امکان نہیں ہے کہ جس راہ پر وہ چل پڑے ہیں اس سے مڑ کر کسی اور راہ کو اختیار کر سکیں۔

غور کیجیے تو یہ تمثیل ٹھیک یہود کے اس گروہ پر منطبق ہو رہی ہے جس کا ذکر پہلے ہوا ہے اور جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ ان کے دلوں اور ان کے کانوں پر مہر لگ چکی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردے پڑ چکے ہیں اس وجہ سے اب وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔

تمثیل میں آگ جلانے والے شخص سے اشارہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف ہے۔ انھوں نے اپنی قوم کے لیے ہدایت کی شمع جلائی اور اس شمع نے پوری قوم کے لیے اجالا بھی کر دیا لیکن زیادہ زمانہ نہیں گزرا کہ بنی اسرائیل کی اکثریت اس روشنی سے بیزار ہو گئی جس کی سزا میں اللہ تعالیٰ نے ان کے اوپر لعنت کر دی اور وہ ہدایت کی باتیں سمجھنے اور قبول کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو گئے۔

بنی اسرائیل کی اس محرومی و بدبختی کی تفصیلات تورات و انجیل میں بھی بیان ہوئی ہیں اور قرآن میں بھی اس کا ذکر مختلف مقامات میں آیا ہے۔ یہاں ان کی اسی حالت کو تمثیل کی صورت میں پیش کیا گیا ہے، یہ تمثیل ایک قافلہ کی ہے جس کے تمام افراد بہرے، گونگے اور اندھے ہیں، مزید براں رات اندھیری ہے اور اس اندھیری رات میں یہ قافلہ بھٹک رہا ہے، نہ یہ کسی کی سنتا ہے، نہ کسی کو پکار سکتا ہے نہ کسی کا

---

[1] صم بکم عمی سے متعلق استاذ امام مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ افادہ یہاں قابلِ ذکر ہے کہ اگر صفات کا بیان بغیر حرفِ عطف کے ہو تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ تمام صفات موصوف کے اندر بیک وقت موجود ہیں۔

جواب دے سکتا ہے اور نہ کسی نشان یا روشنی سے رہنمائی حاصل کرسکتا ہے۔

دوسری تمثیل ایک ایسے قافلہ کی ہے جو رات کی تاریکی میں بارش میں گھر گیا ہے۔ گھٹا ٹوپ اندھیرا ہے، بارش زوروں کی ہو رہی ہے، بارش کے ساتھ کڑک اور چمک بھی ہے۔ قافلہ والوں کا حال یہ ہے کہ جب کڑکا ہوتا ہے مارے خوف کے کانوں میں انگلیاں دے لیتے ہیں، جب بجلی کوندتی ہے تو اس کی روشنی میں چند قدم چل لیتے ہیں۔ جب غائب ہو جاتی ہے تو کھڑے ہو جاتے ہیں۔

دوسری تمثیل اور اس کا مصداق

یہ تمثیل یہود کے اس دوسرے گروہ کی تصویر ہے جس کا ذکر ومن الناس الآیہ سے شروع ہوتا ہے۔ اس میں بارش سے اشارہ قرآن مجید کی طرف ہے۔ ظلمات سے اشارہ ان مشکلات راہ کی طرف ہے جن سے قرآن کی دعوت قبول کرنے والوں کو لازماً دوچار ہونا پڑتا تھا۔ رعد و برق سے مراد قرآن کی وہ دھمکیاں اور وعیدیں ہیں جو قرآن اپنے جھٹلانے والوں کو سنا رہا تھا اور جن کی زد خاص طور پر یہود پر پڑ رہی تھی۔ اس گروہ کو چونکہ قرآن کے حق ہونے کا پورا پورا احساس تھا اس وجہ سے یہ دھمکیاں اور وعیدیں ان کو بڑی شاق گزرتی تھیں۔ ان کا صحیح علاج یہ تھا کہ یہ قرآن کی دعوت قبول کر لیتے لیکن انھوں نے اس کے بالکل برعکس اس کا علاج یہ سوچا کہ قرآن کی بات سرے سے سنیں ہی نہیں۔ اس صورت حال کو تمثیل اس طرح مصور کر رہی ہے کہ "یہ لوگ موت کے ڈر سے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونسے لے رہے ہیں" ظاہر ہے کہ یہ تدبیر ایک احمقانہ تدبیر ہے۔ اگر بجلی گرا چاہتی ہے تو اس سے بچاؤ کی یہ تدبیر کیا کارگر ہو سکتی ہے کہ آپ کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں؛ یہ تو بالکل ایسی ہی بات ہے کہ ایک شخص شیر کو دیکھے کہ وہ اس پر حملہ کیا چاہتا ہے لیکن وہ اپنی آنکھیں بند کر لے۔ کسی کے اس طرح آنکھیں بند کر لینے سے یہ تو ہونے سے رہا کہ شیر حملہ کرنے سے باز آ جائے۔ البتہ یہ ہوگا کہ اس کو شیر کا حملہ نظر نہیں آئے گا۔

اسی طرح قرآن مجید کی وعیدوں اور دھمکیوں کا یہ علاج کہ وہ سنی نہ جائیں ایک احمقانہ علاج ہے۔ اس سے ان کی واقعیت میں تو کوئی فرق پیدا نہیں ہوگا البتہ اگر ہوگا تو یہ ہوگا کہ یہ اس وقت واقع ہوں گی جب آدمی ان سے بالکل غافل ہوگا۔ شتر مرغ کے متعلق مشہور ہے کہ جب وہ طوفان کا خطرہ محسوس کرتا ہے تو اپنا سر ریت میں چھپا لیا کرتا ہے۔ کسی حقیقت سے فرار کے لیے یہود کے اس گروہ کی یہ پالیسی بھی شتر مرغ کی اس پالیسی سے کچھ مختلف نہ تھی۔

"جب بجلی چمکتی ہے تو چند قدم چلتے ہیں، جب غائب ہو جاتی ہے تو کھڑے ہو جاتے ہیں" یہ ان کی اس حیرانی و پریشانی کی تصویر ہے جس میں قرآن مجید کے نزول کے بعد وہ مبتلا ہو گئے تھے۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ قرآن کا مقابلہ کس طرح کریں۔ اس کی چمک اور دمک نگاہوں کو خیرہ کر دینے والی تھی اور اس کی برق خاطف سے ان کے لیے بچنا ممکن نہیں رہ گیا تھا۔ وہ حیران و درماندہ تھے کہ کیا کریں۔ اس حیرانی و درماندگی کی حالت میں اگر کوئی بات بنتی نظر آتی تھی تو بنانے کی کوشش کرتے تھے لیکن کسی حقیقت

کا مقابلہ محض سخن سازی سے زیادہ دیر تک ممکن نہیں ہے اس وجہ سے جب بنائی ہوئی بات بگڑ جاتی تو پھر حیران و درماندہ ہو کر بغلیں جھانکنے لگتے۔ چنانچہ اوپر ذکر ہوا ہے کہ یہ مسلمانوں کو چکمہ دینے کے لیے یہ کہتے تھے کہ تم خدا اور آخرت پر ایمان کے مدعی ہو تو خدا اور آخرت پر تو ہم بھی ایمان رکھتے ہیں لیکن جب اس پر یہ گرفت ہو جاتی کہ اگر ایمان کا دعوٰی ہے تو سیدھے سیدھے مسلمانوں کی طرح کیوں ایمان نہیں لاتے تو پھر مجبور ہو کر مسلمانوں کے خلاف زہر اگلنے اور ان کو گالیاں دینے لگتے۔

۱۷۔ دونوں گروہوں میں فرق

اس تفصیل سے یہ حقیقت تو واضح ہو گئی کہ مذکورہ دونوں تمثیلیں یہود ہی کے دو گروہوں کی ہیں لیکن اس بات کی مزید وضاحت کی ضرورت ہے کہ ان دونوں گروہوں میں فرق و اختلاف کی نوعیت کیا ہے؟ عام طور پر تو، جیسا کہ ہم نے ذکر کیا، لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ایک گروہ کفار منکرین کا ہے اور دوسرا گروہ منافقین کا۔

جہاں تک پہلے گروہ کا تعلق ہے وہ تو بلاشبہ قرآن اور اسلام کے جامد مخالفین ہی کا ہے لیکن دوسرے گروہ کے متعلق ہم اوپر یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ اس کو عام معنی میں منافقین کا گروہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ منافقین جہاں تک کم از کم ظاہر کا تعلق ہے اپنے آپ کو مسلمانوں سے الگ نہیں رکھتے تھے لیکن ان لوگوں کا جو حال اوپر بیان ہوا ہے اس سے صاف واضح ہے کہ یہ لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان کا دعوٰی تو کرتے تھے لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کا اظہار نہ تو عملاً کرتے تھے اور نہ قولاً کرنے کے لیے تیار تھے، حد یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں کو علانیہ بے وقوف ٹھہراتے تھے۔ ایسی صورت میں ان کو عام معنی میں منافقین کے زمرے سے سمجھنا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے؟

ہمارے نزدیک یہ دونوں گروہ ہیں تو یہود ہی کے اور دونوں اسلام اور قرآن کے مخالف بھی ہیں لیکن دونوں کی مخالفت کے مزاج الگ الگ ہیں۔ پہلے گروہ کی مخالفت کا مزاج جمود اور ہٹ دھرمی ہے، یہ اندھوں اور بہروں کی طرح انکار پر جم گیا ہے اور اپنی رائے کے خلاف کوئی بات بھی سننے اور دیکھنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ دوسرے کی مخالفت کا مزاج حاسدانہ لیکن ساتھ ہی بزعم خود مصلحت اندیشانہ بھی ہے۔ یہ ان تمام خطرات کو بھانپ رہا ہے جو اسلام کے ظہور سے یہودیت اور نصرانیت سب کے لیے پیدا ہو گئے ہیں۔ اس کی خواہش اور کوشش یہ ہے کہ کسی طرح ان خطرات کا سد باب کرے۔ اس مقصد کے لیے جو تدبیر اس کی سمجھ میں آتی ہے، وہ یہ ہے کہ جس حد تک اپنے آبائی طریقہ پر قائم رہتے ہوئے اسلام اور مسلمانوں کی ہم آہنگی کی جا سکے ان کی ہم آہنگی کی جائے اور ساتھ ہی ان سے بھی یہ مطالبہ کیا جائے کہ وہ بھی اپنی انفرادیت سے دست بردار ہو کر دین داری اور خدا پرستی کا کوئی مقام ان کے لیے بھی تسلیم کریں

پر راضی ہو جائیں لیکن قرآن نے اس بات کو نہایت غیر مبہم الفاظ میں ظاہر کر دیا ہے کہ دینِ حق اس قسم کی سودا بازی کے لیے نہیں آیا ہے، جس کو ایمان لانا ہو وہ سیدھے سیدھے مسلمانوں کی طرح ایمان لائے ورنہ جو راہ اس کو پسند ہے اس کو اختیار کرے اور اس کے نتائج بھگتے۔

اگرچہ پہلے گروہ کی ہٹ دھرمی اور ضد کی طرح اس دوسرے گروہ کی یہ چالبازی بھی اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض ہے لیکن اس گروہ کا یہ احساس کہ قرآن کا مقابلہ ہٹ دھرمی اور ضد سے نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کے لیے ہوشیاری اور مصلحت بینی کی ضرورت ہے اس بات کا ثبوت ہے کہ پہلے گروہ کی طرح قبولیتِ حق کی صلاحیت اس کے اندر بالکل مردہ نہیں ہو چکی ہے بلکہ اس کے اندر اس صلاحیت کی کچھ نہ کچھ رمق ابھی باقی ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اگر اس نے بھی اس صلاحیت سے فائدہ نہ اٹھایا بلکہ حق سے فرار کی انھی تدبیروں میں مشغول رہا جن میں اس وقت مشغول ہے تو سنتِ الٰہی کے مطابق اس کی یہ رہی سہی صلاحیت بھی سلب ہو جائے گی۔ اسی حقیقت کی طرف قرآن کے یہ الفاظ اشارہ کر رہے ہیں وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (اگر اللہ چاہتا تو ان کے کان اور ان کی آنکھیں سلب کر لیتا (لیکن وہ ہر ایک کو پوری مہلت دیتا ہے) بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے)

۱۸۔ آگے کا مضمون —— آیات ۲۱-۲۹

ان دونوں تمثیلوں کے بعد ذرا دیر کے لیے یہود سے صرف نظر کر کے چند آیتوں میں بنی اسماعیل (عربوں) کو خطاب کیا گیا ہے اور ان کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ اس نعمت کی قدر کریں اور قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں۔ اصل سلسلۂ کلام سے ہٹ کر اس دعوت کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ یہود کی اس مخالفت کا اصلی محرک وہ حسد تھا جو وہ بنی اسماعیل سے اس بنا پر پہلے سے رکھتے تھے کہ ان کے صحیفوں میں یہ پیشین گوئی کی گئی تھی کہ آخری نبی امیوں (بنی اسماعیل) کے اندر پیدا ہوں گے۔ اس پیشین گوئی نے قرآن کے نزول اور اسلام کے ظہور سے جب ایک واقعہ کی شکل اختیار کر لی اور یہود پر اس کی صداقت کے آثار ظاہر ہو گئے تو ان کا یہ حسد، جو اب تک چھپا ہوا تھا، بالکل بے نقاب ہو کر سامنے آ گیا۔ انھوں نے یہ ٹھان لی کہ جس طرح بھی ممکن ہو گا اس دعوت کو ناکام بنائیں گے اور دینی پیشوائی کی جو عزت ان کو اب تک حاصل رہی ہے اس کو عربوں کی طرف منتقل نہ ہونے دیں گے۔ اس مقصد کے پیش نظر وہ جس طرح اپنی قوم کے لوگوں کو اسلام سے دور رکھنے کے لیے طرح طرح کے شگوفے چھوڑا کرتے تھے اسی طرح عربوں کے اندر بھی مختلف قسم کی وسوسہ اندازیاں کرتے رہتے تھے تاکہ یہ اس نعمت سے محروم رہ جائیں جو قرآن کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے ان پر نازل فرمانی چاہی ہے اور جس کے نتیجے میں ان کو تمام عالم کی امامت و سیادت حاصل ہو سکتی ہے۔ یہود اس قسم کی سازشوں میں ہمیشہ سے استاد رہے ہیں اس وجہ سے سادہ لوح عرب

ان کے حکموں میں آجاتے تھے اور اسلام کے خلاف یہودیوں کے اٹھائے ہوئے اعتراضات کو بے سمجھے بوجھے خود بھی دہرانا شروع کر دیتے تھے۔ قرآن نے یہاں اصل سلسلہ کلام کو تھوڑی دیر کے لیے روک کر ان کو متنبہ کیا کہ تم اللہ کی اس کتاب پر جس کی حجت تمہارے اوپر پوری ہو چکی ہے ایمان لاؤ، اگر تم نے محض یہود کی وسوسہ اندازیوں کے فریب میں مبتلا ہو کر اس نعمت عظمیٰ سے اپنے آپ کو محروم کر لیا تو یاد رکھو کہ اس کی سزا بڑی ہی سخت ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

آیات ۲۱-۲۹

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً ۠ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾ وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰي عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۠ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۳﴾ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ښ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۴﴾ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا ھٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ۭ وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ڎ وَّھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۭ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ

بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ۭ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۝٢٦
الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠ وَيَقْطَعُوْنَ
مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ
هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝٢٧ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا
فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝٢٨
هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۤ ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى
السَّمَاۗءِ فَسَوّٰىھُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ۭ وَھُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝٢٩ ع ٣

ترجمہ آیات ۲۱-۲۹

اے لوگو، بندگی کرو اپنے اس خداوند کی جس نے تم کو بھی پیدا کیا اور ان کو بھی جو تم سے پہلے گزرے ہیں، تاکہ دوزخ کی آگ سے محفوظ رہو۔ اس کی بندگی، جس نے تمھارے لیے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت بنایا اور اتارا آسمان سے پانی اور اس سے پیدا کیے پھل تمھاری روزی کے لیے۔ تو تم اللہ کے ہم سر نہ ٹھہراؤ درآں حالے کہ تم جانتے ہو۔ ۲۱-۲۲

اگر تم اس چیز کی جانب سے شک میں ہو جو ہم نے اپنے بندے پر اتاری ہے تو لاؤ اس کے مانند کوئی سورہ اور بلا لو اپنے حمایتیوں کو بھی اللہ کے سوا، اگر تم سچے ہو۔ پس اگر تم نہ کر سکو اور ہرگز نہ کر سکو گے تو اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن بنیں گے آدمی اور پتھر، جو تیار ہے کافروں کے لیے اور بشارت دو ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک کام کیے اس بات کی کہ ان کے لیے ایسے باغ ہوں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ جب جب اس کے پھل ان کو کھانے کو ملیں گے تو کہیں گے، یہ وہی ہے جو اس سے پہلے ہمیں عطا ہوا تھا۔ اور ملے گا اس سے ملتا جلتا اور ان کے لیے اس میں پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ (۲۳-۲۵)

اللہ اس بات سے نہیں شرماتا کہ وہ کوئی تمثیل بیان کرے، خواہ وہ مچھر کی ہو یا اس سے

بھی کسی چھوٹی چیز کی۔ تو جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہی بات حق ہے ان کے رب کی جانب سے، رہے وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا تو وہ کہتے ہیں کہ اس تمثیل کے بیان کرنے سے اللہ کا کیا منشا ہے؟ اللہ اس چیز سے بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو ہدایت دیتا ہے اور وہ گمراہ نہیں کرتا مگر انھی لوگوں کو جو نافرمانی کرنے والے ہیں، جو اللہ کے عہد کو اس کے باندھنے کے بعد توڑتے ہیں اور جس چیز کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے اس کو کاٹتے ہیں اور زمین میں فساد مچاتے ہیں یہی لوگ ہیں جو نامراد ہونے والے ہیں۔ ۲۶-۲۷

تم اللہ کا کس طرح انکار کرتے ہو اور حال یہ ہے کہ تم مُردہ تھے تو اس نے تم کو زندہ کیا، پھر وہ تم کو موت دیتا ہے پھر زندہ کرے گا، پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ وہی ہے جس نے تمھارے لیے وہ سب کچھ پیدا کیا جو زمین میں ہے پھر آسمان کی طرف توجہ کی اور سات آسمان استوار کر دیے اور وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔ ۲۸-۲۹

۱۹- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

'یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ' کا خطاب مشرکین سے ہے

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ (۲۱)

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ سے خطاب اگرچہ بظاہر عام ہے لیکن یہاں مخاطب، جیسا کہ اوپر گزرا، خاص طور پر مشرکین عرب ہیں۔ اس خطاب کو مشرکین کے ساتھ مخصوص ماننے کی وجہ ہمارے نزدیک یہ ہے کہ اس کے بعد جو بات کہی گئی ہے، جو طرزِ استدلال اختیار کیا گیا ہے اور مخاطب سے جو مطالبہ کیا گیا ہے، ہر چیز اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ یہاں خطاب کا اصلی رُخ مشرکین ہی کی طرف ہے، یہود کے ذکر کے بیچ میں یہ خطاب بطور ایک التفات کے آ گیا ہے۔

اُعْبُدُوْا رَبَّکُمْ: لفظ عبادت کی تحقیق سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔ یہاں اُعْبُدُوْا رَبَّکُمْ سے مقصود مشرکین کو صرف خدا کی بندگی کی دعوت دینا نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ خدا کی بندگی کی اس دعوت کو قبول کریں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے ہیں۔ اس کلام کی یہی پوشیدہ حقیقت ہے جس کی وجہ سے اس کے ساتھ وان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا کا ربط موزوں ہوا۔ یعنی پیغمبر جس بندگی کی

دعوت دے رہے ہیں اس کو قبول کرو اور اگر تمھیں اس کتاب کے بارے میں شبہ ہے کہ یہ کوئی من گھڑت چیز ہے، خدا کی اتاری ہوئی نہیں ہے، تو تم بھی اس کے مانند کوئی سورہ پیش کرو۔

نیز اس کے اندر یہ بات بھی چھپی ہوئی ہے کہ تم خدا کی جس بندگی کے مدعی ہو وہ درحقیقت خدا کی بندگی نہیں ہے، خدا کی بندگی کا صحیح طریقہ وہی ہے جس کی دعوت یہ کتاب دے رہی ہے۔

خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ: خَلَقَكُمْ کے ساتھ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ کا اضافہ اس لیے فرمایا ہے کہ مشرکین عرب اس بات کے تو قائل تھے کہ ان کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے لیکن اپنے بزرگوں میں سے انھوں نے بعضوں کو خدائی صفات میں شریک قرار دے کر خالق کی صف میں کھڑا کر دیا تھا اور ان کے بت بنا کر ان کی پرستش کرنے لگ گئے تھے۔ یہاں قرآن نے ان کے ساتھ ساتھ ان کے تمام اگلوں کو بھی عام مخلوقاتِ الٰہی میں شامل کر کے اشارۃً اس بات کی طرف بھی توجہ دلا دی کہ خدا کی بندگی کرنی ہے تو نہ صرف اپنے آپ کو مخلوق و مقہور مان کر خدا کے آگے جھکو بلکہ ان کو بھی خدا ہی کی مخلوق مانو جن کو تم نے اپنی حماقت سے خالق کا درجہ دے رکھا ہے۔

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ: لعل مختلف معنوں کے لیے آتا ہے جن میں سے کسی چیز کے ممکن و متوقع نتیجہ کے بیان کے لیے بھی اس کا استعمال مشہور و معروف ہے، ہم نے اس کو اسی معنی میں یہاں لیا ہے اور جس سیاق میں یہاں یہ لفظ استعمال ہوا ہے ہمارے نزدیک اس کے یہی معنی صحیح ہیں۔

تَتَّقُونَ کے یہاں دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ تم تقویٰ حاصل کرو، دوسرے یہ کہ تم خدا کے غضب اور اس کے عذاب سے بچو۔ یہاں دونوں معنوں کے صحیح ہونے کا امکان ہے لیکن ہم نے دوسرے معنی کو ترجیح دی ہے۔ اس صورت میں اس کے مفعول کو محذوف ماننا پڑے گا۔ اس محذوف کو قرآن نے اس کے بعد والی آیت میں خود کھول دیا ہے۔ فرمایا ہے۔ فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ (۲۴-بقرہ) (پس اس آگ سے بچو جس کے ایندھن آدمی اور پتھر بنیں گے)

الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَكُمْ فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَنْدَادًا وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ (۲۲)

فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَنْدَادًا وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ: انداد ندّ کی جمع ہے جس کے معنی ہمسر، ہم پایہ، مدِّ مقابل، مشابہ اور کفو کے ہیں۔

اہل عرب صفات باری سے متعلق ان تمام بنیادی مقدمات کو تسلیم کرتے تھے جن سے بدیہی طور پر توحید ثابت ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود وہ خدا کے شریک بھی مانتے تھے اس وجہ سے یہ فرمایا کہ جب تم خود اس بات کو جانتے ہو کہ خدا ہی نے تمھیں پیدا کیا ہے، اسی نے تمھارے اگلوں کو پیدا کیا ہے، اسی نے تمھارے لیے زمین کا فرش بچھایا ہے، اسی نے آسمان کا شامیانہ تانا ہے، اسی نے آسمان سے پانی اتارا

ہے اور اسی نے تمھارے رزق کے لیے قسم قسم کے پھل اور میوے پیدا کیے ہیں تو پھر ان کو خدا کا شریک کیوں ٹھہراتے ہو جنھوں نے ان کاموں میں سے کوئی ایک کام بھی نہیں کیا ہے، یہاں جانتے ہو، کا مفہوم یہ ہے کہ ان ساری باتوں کو مانتے اور ان کا اقرار کرتے ہو۔

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۲۳)

شہید کا مفہوم

اُدْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ: شہید، قوم کے اس لیڈر، ترجمان اور نمائندہ کو کہتے ہیں، جو اہم مواقع پر اس کی ترجمانی اور نمائندگی کرتا ہے اور اس کا حمایتی بن کر کھڑا ہوتا ہے۔ یہ حمایتی انسانوں میں سے بھی ہو سکتے تھے اور اہلِ عرب کے اعتقاد کے مطابق جنوں میں سے بھی ہو سکتے تھے۔ عرب جاہلیت میں شاعروں اور خطیبوں کی بڑی عزت و عظمت تھی کیونکہ یہی لوگ تمام اہم مواقع پر قومی وقار کے محافظ بن کر کھڑے ہوتے تھے مشرکین عرب یہ عقیدہ بھی رکھتے تھے کہ ہر شاعر کے ساتھ ایک جن ہوا کرتا ہے جو اس کو شعر الہام کرتا ہے۔ چنانچہ وہ قرآن کے متعلق بھی یہ گمان رکھتے تھے کہ یہ بھی اسی قسم کے الہام کا کرشمہ ہے۔ ان کے انھی خیالات کی بنا پر ان سے مطالبہ کیا گیا کہ اگر تم قرآن کو کسی انسان یا جن کی گھڑی ہوئی چیز سمجھتے ہو تو اپنے ان حمایتیوں کی مدد سے اس کے مانند ایک ہی سورہ پیش کر دو، اگر یہ تمھارے حمایتی اس نازک موقع پر بھی، جب کہ تمھارے آبائی دین کے ساتھ ساتھ خود ان کی خدائی بھی معرضِ خطر میں ہے، تمھاری مدد کے لیے نہ اٹھیں تو سمجھ لو کہ یہ قرآن خدائی کلام ہے اور تمھارے یہ سارے دیوی دیوتا بالکل بے حقیقت ہیں۔ قرآن میں دوسرے مواقع پر اس مضمون کی وضاحت بھی موجود ہے۔ مثلاً فرمایا ہے قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا (۸۸۔ بنی اسرائیل) (کہہ دو اگر تمام جن و انس متفق ہو کر بھی زور لگائیں کہ اس قرآن کی مثال پیش کریں تو اس کی مثال نہ پیش کر سکیں گے اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار بھی بن جائیں) دوسری جگہ اس مضمون کی مزید وضاحت ہوئی ہے۔ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ فَاِلَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ (۱۳-۱۴۔ ھود) (اور اللہ کے سوا جن کو بھی تم بلا سکتے ہو اپنی مدد کے لیے بلا لو اگر تم سچے ہو، پس اگر وہ تمہاری امداد کو نہ پہنچیں تو سمجھ لو کہ یہ چیز اللہ کے علم سے اتری ہے)

اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ: اگر تم سچے ہو کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ تم قرآن کے بارے میں جو گمان رکھتے ہو اگر اس میں سچے ہو۔ دوسرا یہ کہ اگر تم اپنے اس خیال میں سچے ہو کہ خدا کے سوا تمھارے کچھ اور حمایتی اور مددگار بھی ہیں۔ اگر فی الواقع تمھارے کچھ حمایتی اور مددگار موجود ہیں تو ان کو مدد کے لیے بلاؤ، اس سے زیادہ ان کی مدد طلب کرنے اور ان کے تمھاری مدد کے لیے اٹھنے کا اور کون سا موقع اہم ہو سکتا ہے!

میرا اپنا رجحان اس دوسرے مفہوم کی طرف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ پہلے مفہوم پر بھی حاوی ہو جاتا ہے۔

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۖ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ (۲۴)

بتوں کو عذاب دینے کی وجہ

وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ: یہ الفاظ اس آگ کے مزاج کو ظاہر کر رہے ہیں جس سے قرآن کے ان جھٹلانے والوں کو ڈرایا گیا ہے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آگ کے مرغوب ایندھن اول تو وہ لوگ ہوں گے جن کے اندر کفر اور شرک کا مواد موجود ہوگا، انھی کے جسموں سے یہ آگ اپنے اصلی رنگ میں بھڑکے گی اور دوسرے درجہ پر اس کے ایندھن وہ پتھر ہوں گے جو معبود کی حیثیت سے دنیا میں پوجے گئے ہیں یا پوجے جا رہے ہیں کیونکہ اس پرستش کے سبب سے شرک کا وہ آتش گیر مادہ کچھ نہ کچھ ان کے اندر بھی پیدا ہو جاتا ہے جو اس آگ کی محبوب غذا ہے۔

اَلْحِجَارَةُ کا لفظ اگرچہ عام ہے لیکن موقع کلام سے واضح ہے کہ اس سے مراد وہی تراشے ہوئے پتھر ہیں جن کی دیوی دیوتا کی حیثیت سے پرستش ہوتی ہے۔ ان کو دوزخ میں پھینکنے سے مقصود دراصل ان کو عذاب دینا نہیں بلکہ ان کے پرستاروں کے عذاب میں اضافہ کرنا ہوگا۔ اس طرح ان کو دکھایا جائے گا کہ جن کے آگے وہ دنیا میں ڈنڈوت کرتے رہے ہیں اور جن کی ضیافت کے لیے دودھ اور حلوے پیش کرتے رہے ہیں ان کی یہاں کیا گت بن رہی ہے۔

کفر کے شعائر کی توہین سے مقصود درحقیقت کفر کی توہین ہوتی ہے۔ اس ساری حقیقت کی وضاحت قرآن مجید نے ایک دوسرے مقام پر خود فرما دی ہے:

اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ۭ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ ۝ لَوْ كَانَ هٰٓؤُلَاۗءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا ۭ وَكُلٌّ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ ۹۸-۹۹ (الانبیاء)	تم اور وہ چیزیں جن کی تم خدا کے سوا پرستش کرتے ہو سب جہنم کا ایندھن بنو گے، تم سب کو اس میں جانا ہوگا، اگر یہ واقعی معبود ہوتے تو جہنم میں نہ پڑتے اور تم سب اس میں ہمیشہ رہو گے۔

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا ھٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ۭ وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ڎ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۲۵)

جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ: باغ کا سب سے زیادہ دلکش تصور یہ ہے کہ وہ بلندی پر ہو اور اس کے نیچے نہر جاری ہو۔ بلندی اس کے منظر کی دل کشی میں اضافہ کرتی ہے اور سیلاب وغیرہ کی آفتوں سے محفوظ رکھتی ہے اور نیچے بہنے والی نہر اس کی شادابی کی ضمانت دیتی ہے۔ بلندی کے باغ کی تمثیل اسی

سورہ کی آیت ۲۶۵ میں بھی موجود ہے کَمَثَلِ جَنَّۃٍۭ بِرَبْوَۃٍ الآیۃ۔ زیر بحث آیت میں تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ کے الفاظ سے یہ بات خود بخود واضح ہو رہی ہے کہ یہ باغ بلندی پر ہوں گے۔

قول کی مختلف شکلیں

قَالُوْا ھٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ، قول کی کئی شکلیں ہوتی ہیں۔ ایک قول وہ ہوتا ہے جو سنا جاتا ہے۔ ایک قول وہ ہوتا ہے جو سرًا ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے سَوَآءٌ مِّنْکُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَھَرَ بِہٖ (۱۰ رعد) (یکساں ہیں تم میں سے وہ جو قول کو پوشیدہ رکھیں اور وہ جو اس کو ظاہر کریں) اظہار اشارہ کے لئے بھی یہ لفظ آتا ہے، مثلاً:

فَقُوْلِیْٓ اِنِّیْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ	اشارہ سے بتا دے کہ میں نے خدائے رحمان کے
صَوْمًا فَلَنْ اُکَلِّمَ الْیَوْمَ	لیے روزے کی منت مانی ہے، آج میں کسی انسان
اِنْسِیًّا ۔ (۲۶۔ مریم)	سے کلام نہیں کروں گی۔

زبانِ حال و فعل سے جو اشارہ نکلتا ہے وہ بھی قول کی ایک شکل ہے۔ علیٰ ہذا القیاس جو بات آدمی اپنے دل میں کہتا ہے اس کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ کلامِ عرب اور قرآن مجید میں اس کی بہت سی نظیریں موجود ہیں مثلاً سورۂ مائدہ میں منافقین کا حال بیان ہوا ہے:

یَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓی اَنْ تُصِیْبَنَا دَآئِرَۃٌ	وہ کہتے ہیں ہمیں اندیشہ ہے کہ کوئی مصیبت نہ ہم پر آ پڑے
فَعَسَی اللّٰہُ اَنْ یَّاْتِیَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ	تو بہت ممکن ہے کہ اللہ فتح لائے یا اپنی طرف سے
مِّنْ عِنْدِہٖ فَیُصْبِحُوْا عَلٰی مَآ اَسَرُّوْا	کوئی اور بات دکھائے اور ان کو اس بات پر نادم
فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ نٰدِمِیْنَ (۵۲۔ مائدہ)	ہونا پڑے جو یہ اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں۔

مذکورہ آیت میں ان منافقین کے دل کے خیال کو قول سے تعبیر فرمایا ہے اور پھر یہ تصریح بھی فرما دی ہے کہ یہ ان کے دل کی چھپی ہوئی بات ہے۔ اسی طرح زیر بحث آیت میں قَالُوْا، سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے دلوں میں خیال کریں گے کہ دنیا میں ہمیں قرآن مجید اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے جن نعمتوں کے مزے اپنی بشارتوں سے چکھائے تھے وہی نعمتیں ہمارے سامنے اب اپنی حقیقی شکل و صورت میں آ رہی ہیں۔ یہ خیال ایک گہری مسرت، ایک عمیق احساسِ کامیابی اور ایک پُرجوش جذبۂ شکر و سپاس کے ساتھ ان کے دلوں میں پیدا ہوگا۔ وہ خوش ہوں گے کہ الحمد للہ جن وعدوں پر وہ جیے اور مرے وہ سب سچے ثابت ہوئے اور جس جنت کی نعمتوں کے مزے اب وہ لوٹ رہے ہیں اس کی ایک تمثیلی سیر قرآن کی بدولت انھوں نے دنیا ہی میں کر لی تھی۔

رزق کی دو قسمیں

اس ٹکڑے میں رزق کا لفظ بھی قابلِ غور ہے۔ یہ لفظ عربی زبان میں بھی اور قرآن میں بھی رزق مادی اور رزق روحانی دونوں ہی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ صرف کھانے پینے کی چیزوں ہی کو رزق نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ اصلی رزق وہ علم و معرفت ہے جو قرآن اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمیں حاصل ہوا ہے

اسی وجہ سے وحی کو قرآن نے رزق کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے اور حضرت مسیح علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ آدمی صرف روٹی سے نہیں جیتا بلکہ اس کلمہ سے جیتا ہے جو خدا کی طرف سے آتا ہے۔

'مِن قَبْلُ' کی دو تاویلیں لوگوں نے کی ہیں ایک یہ کہ اس سے پہلے دنیا میں، دوسری یہ کہ اس سے پہلے اسی جنت میں۔ میرے استاذ مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے ان دونوں تاویلوں کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے لیکن میرے نزدیک، جیسا کہ میں نے اوپر اشارہ کیا ہے، یہ اشارہ دنیا کی طرف ہے، اس کے وجوہ آگے چل کر واضح ہوں گے۔

'ازواج مطہرۃ' کا مفہوم

اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ: زوج کے معنی جوڑے کے ہیں، عورت کے لیے مرد جوڑا ہے اور مرد کے لیے عورت۔ انسان کے اندر قدرت نے خود ایک خلا چھوڑا ہے جو اس جوڑے کے سوا کسی اور شکل سے پورا نہیں ہوتا اس وجہ سے اس کے بغیر انسان کے لیے کسی نعمت کا تصور بھی کامل نہیں ہوتا چنانچہ جنت میں بھی، جو کمال نعمت کی تعبیر ہے، اس کا ذکر موجود ہے۔ اس کے ساتھ 'مطہرۃ' کی صفت اس حقیقت کو ظاہر کر رہی ہے کہ نہایت اہتمام کے ساتھ ان کی تربیت ہوئی ہے اور ان کا تزکیہ کیا گیا ہے تاکہ وہ اہل جنت کی رفاقت کے لیے پوری طرح موزوں ہو سکیں۔ یہ مفہوم لفظ مطہرۃ سے نکلتا ہے اس لیے کہ تطہیر کے معنی ہیں خاص اہتمام و توجہ کے ساتھ کسی کے عادات و خصائل اور طبیعت و مزاج کو سنوارنا اور پاکیزہ بنانا۔ سورۂ احزاب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت کو بہت سے ضروری آداب کی تعلیم دینے کے بعد فرمایا ہے۔

اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ	اللہ تو بس یہ چاہتا ہے، اے نبی کے اہل بیت
الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ	کہ تم سے آلائش دنیا کو دور کرے اور تمھیں
تَطْهِيْرًا (۳۳ - احزاب)	پاک کرے جیسا کہ پاک کرنے کا حق ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ؕ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ (۲۶)

تمثیل کی اصل قدر و قیمت

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا: ضرب مثل کے معنی ہیں کسی حقیقت کو تمثیل کے پیرایہ میں سمجھانا۔ اعلیٰ حقائق اور روحانی لطائف کو جب تک تمثیل کا جامہ نہ پہنایا جائے اس وقت تک وہ عام عقل کی گرفت میں نہیں آتے اس وجہ سے روحانی حقائق کی تعلیم میں اس صنف کلام کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ چنانچہ انبیا اور حکما کے کلام میں اس کی بڑی کثرت ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ تورات اور انجیل پر ایک نظر ڈالنے سے ہو سکتا ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کا کلام تمثیلات سے بھرا ہوا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں بھی بے شمار تمثیلات ہیں۔ قرآن میں بھی اس صنف کلام کی نہایت اعلیٰ مثالیں موجود ہیں۔

تمثیل میں جو چیز دیکھنے کی ہوتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ اس میں جو حقیقت پیش کی گئی ہے وہ کتنی خوبی کے ساتھ پیش ہوئی ہے۔ اس چیز سے کچھ زیادہ بحث نہیں ہوتی کہ تمثیل کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں۔ ایک حقیقت کو نگاہوں کے سامنے مصور کر دینے کے لیے جو چیز بھی مفید مقصد ہو سکتی ہے اس سے تمثیل میں فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ خواہ وہ مکھی ہو یا مچھر یا مکڑی۔ قرآن مجید نے مشرکین کے معبودوں کی بے بسی کی مثال دیتے ہوئے کہا ہے کہ اگر مکھی بھی ان خداؤں سے کوئی چیز چھین لے تو یہ اس کا بھی کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔ اسی طرح شرکا اور شفعا پر ان کو جو اعتماد تھا، اس کی بے حقیقتی کی مثال مکڑی کے جالے سے دی ہے۔ یہود دین کے اصولوں سے بے پروا ہو کر اس کی جزئیات کا جو اہتمام کرتے تھے، حضرت مسیح علیہ السلام نے اس کو مچھر کے چھاننے اور اونٹ کے نگل جانے سے تشبیہ دی ہے۔

یہ ساری تشبیہیں اور تمثیلیں اس اعتبار سے نہایت اعلیٰ درجے کی ہیں کہ ان میں جو حقائق پیش کیے گئے ہیں وہ ان تمثیلوں کے پیرایہ میں نہایت خوبی کے ساتھ ایک عام آدمی کی سمجھ میں بھی آجاتے ہیں۔ اسی وجہ سے علم اور معرفت کے قدر دان ان تمثیلوں کی بڑی قدر کرتے ہیں اور ان سے بڑا فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن جو لوگ علم و معرفت کے دشمن اور خواہشاتِ نفس کے غلام ہوتے ہیں وہ ان تمثیلات سے بہت چڑتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ تمثیلات ان کے لیے وہ چیزیں بے نقاب کرتی ہیں جن کا بے نقاب ہونا ان کے نفس کی خواہشات کے خلاف ہوتا ہے۔ وہ اپنا یہ غصہ جب نکالنا چاہتے ہیں تو براہِ راست اس حقیقت پر حملہ کرنا تو ان کے لیے ممکن نہیں ہوتا جو وہ تمثیل پیش کر رہی ہوتی ہے کیونکہ وہ اس قدر واضح ہوتی ہے کہ اس کے خلاف کچھ کہنا آفتاب پر خاک ڈالنے کے مترادف ہوتا ہے۔ البتہ تمثیل کے کسی جزو کی آڑ لے کر وہ اس کے خلاف اپنا غصہ نکالنے کی کوشش کریں گے۔ مثلاً فرض کیجیے تمثیل میں مکھی یا مچھر کا ذکر آ گیا ہے تو خواہ وہ تمثیل کتنی ہی حقیقت افروز ہو لیکن وہ کہیں گے کہ یہ کیا فضول تمثیل ہے، اگر یہ خدا کا کلام ہے تو کیا خدا کو تمثیل کے لیے مکھی اور مچھر ہی ملتے ہیں؟ اس طرح وہ خود اپنے ضمیر کی آنکھوں میں بھی دھول جھونکنے کی کوشش کریں گے اور دوسروں کی آنکھوں میں بھی دھول جھونکیں گے۔

فسق کے معنی

وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ، فسق کے اصل معنی خروج کے ہیں۔ یہاں سے یہ لفظ معروف سے منکر اور اطاعت سے نافرمانی کی طرف نکل جانے کے لیے استعمال ہوا۔ قرآن مجید میں ابلیس کے متعلق ہے۔ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ (۵۰۔ کہف) (وہ جنات میں سے تھا پس اس نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی۔

معروف سے منکر اور اطاعت سے نافرمانی کی طرف نکل جانے کے مختلف مدارج ہو سکتے ہیں۔ منکر چھوٹا بھی ہو سکتا ہے اور بڑا بھی، اسی طرح نافرمانی معمولی درجہ کی بھی ہو سکتی ہے اور بغاوت کے درجہ کی بھی۔ چنانچہ قرآن میں یہ لفظ عام منکرات سے لے کر کفر و بغاوت تک سب کے لیے استعمال ہوا ہے بلکہ زیادہ تر اس کا

استعمال ان بڑی نافرمانیوں ہی کے لیے ہوا ہے جن کے ساتھ ایمان جمع نہیں ہوتا اس وجہ سے قرآن میں اس لفظ کو اس ہلکے معنی میں ہر جگہ نہیں لینا چاہیے جس معنی میں اس کو عام طور پر ہمارے فقہا اور متکلمین نے لیا ہے۔

الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۲۷)

رشتہ رحم کی اہمیت

وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ: اور اس چیز کو کاٹتے ہیں جس کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے، ہمارے نزدیک اس سے مراد رشتۂ رحم اور رشتۂ قرابت کا کاٹنا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے عہد و پیمان توڑنے کے بعد دوسرا قدم جو ایک نافرمان اٹھاتا ہے وہ حقوق رحم سے بے پروائی یا ان میں بے اعتدالی اور ناانصافی ہے۔ چونکہ تمام صلاح و فلاح اور تمام تمدن و معاشرت کی بنیاد اسلام نے اللہ تعالیٰ سے تقویٰ اور رشتۂ رحم کے احترام پر رکھی ہے اس وجہ سے جو شخص ان دونوں پابندیوں سے آزاد ہوا اس کا ہر اقدام لازماً فساد فی الارض کا موجب ہوگا۔ چنانچہ یہاں بھی اللہ تعالیٰ کے عہد کو توڑنے اور رشتۂ رحم کے کاٹنے کا لازمی نتیجہ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ بیان کیا گیا ہے۔ قرآن میں ان دونوں چیزوں کا ذکر اس طرح ساتھ ساتھ ہوتا ہے گویا یہ لازم و ملزوم ہیں۔ مثلاً فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَكُمْ (۲۲۔ محمد) (پس اغلب ہے کہ اگر تم اعراض کرو تو زمین میں فساد برپا کرو اور اپنے رحمی رشتوں کو کاٹو)

ان دونوں کے اسی لزوم کے سبب سے قتادہ نے یہاں رشتۂ رحم ہی مراد لیا ہے اور ابن جریر نے اسی قول کو ترجیح دی ہے۔ بعض لوگوں نے اس کو عام رکھا ہے اور اس سے ہر اس چیز کا کاٹنا مراد لیا ہے جس کو خدا نے جوڑنے کا حکم دیا ہے۔ جہاں تک ظاہری الفاظ کا تعلق ہے اس معنی کو بھی غلط نہیں قرار دیا جا سکتا۔ لیکن سوال صرف ظاہری الفاظ کا نہیں بلکہ قرآن مجید کے طرز بیان کا ہے۔ قرآن نے یہ طرز بیان جہاں جہاں بھی اختیار کیا ہے موقع و محل دلیل ہے کہ رشتہ رحم ہی کے لیے اختیار کیا ہے۔ اس طرز بیان میں جو ابہام ہے اس سے رشتۂ رحم کی عظمت و اہمیت واضح ہوتی ہے کہ یہ ایسی واضح، بدیہی اور معروف حقیقت ہے کہ بغیر اس کے کہ اس کا نام لیا جائے ہر شخص جانتا اور سمجھتا ہے کہ وہ کیا چیز ہے جس کو خدا نے کاٹنے کا نہیں بلکہ جوڑنے کا حکم دیا ہے اور تمدن اور معاشرے کی صلاح و فلاح کے پہلو سے جس کی اہمیت یہ ہے کہ جس نے اس کو کاٹا اس نے گویا تمدن اور معاشرے کی جڑ ہی پر کلہاڑا رکھ دیا۔

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (۲۸)

کفر کا ایک خاص پہلو

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ: کفر کے معنی کی تحقیق آٹھویں فصل میں بیان ہو چکی ہے۔ یہاں اس لفظ کے ایک

خاص پہلو کی طرف توجہ دلاتی ہے وہ یہ کہ یہ لفظ ان لوگوں کو مخاطب کر کے استعمال کیا گیا ہے جو خدا کے منکر نہیں تھے بلکہ صرف اس کے شریک ٹھہراتے تھے۔ البتہ قیامت کے یا تو وہ منکر تھے یا کم از کم یہ کہ اس کو بہت ہی بعید از قیاس اور بعید از عقل چیز سمجھتے تھے۔ ان لوگوں کو مخاطب کر کے سوال یہ کیا گیا ہے کہ تم اللہ کا کفر کس طرح کرتے ہو؟ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں اس لفظ کا استعمال وسیع معنوں میں ہوا ہے جس طرح خدا کا صریح انکار کفر ہے اسی طرح اس کا وہ ماننا بھی کفر ہے جو اس کی حقیقی صفات مثلاً وحدانیت، قدرت اور علم وغیرہ کی نفی کے ساتھ ہے۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ فَسَوَّاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (۲۹)

'استوار' 'تسویۃ' اور 'سماء' کا مفہوم

ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ فَسَوَّاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ ، استوا کے معنی سیدھے کھڑے ہونے کے ہیں اور الیٰ کے ساتھ اس کا صلہ اس بات پر دلیل ہے کہ یہ لفظ توجہ کرنے یا اس کے ہم معنی کسی مفہوم پر مشتمل ہے۔ مقصود یہ بتانا ہے کہ زمین کو پیدا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے آسمان کو بنایا۔ محض تصویرِ حال کے لیے یہ اسلوب کلام اختیار کیا گیا ہے۔ یہاں کھڑے ہونے یا متوجہ ہونے کا وہی مفہوم لینا چاہیے جو اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کے شایان شان ہے۔

تسویہ کے معنی کسی شے کو برابر کرنے، ہموار کرنے اور اعتدال و توازن کے ساتھ قائم کر دینے کے ہیں۔ اس سقفِ نیلگوں کو جس حد تک ہماری نگاہیں دیکھ سکتی ہیں، خواہ مجرد حالت میں یا سائنس کے ایجاد کیے ہوئے اسلحہ سے مسلح ہو کر، اس کے اندر کوئی رخنہ نہیں تلاش کر سکتیں۔ اسی چیز کو فرمایا ہے۔

مَا تَرَىٰ فِي خَلْقِ الرَّحْمَٰنِ مِن تَفَاوُتٍ ۖ	تم خدائے رحمان کی صنعت کے اندر کوئی کسر نہ
فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرَىٰ مِن فُطُورٍ	پا سکو گے، اپنی نگاہ دوڑاؤ کیا پاتے ہو کوئی رخنہ؟
ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنقَلِبْ إِلَيْكَ	پھر بار بار نظر دوڑاؤ تمہاری نگاہ تھک کر پلٹ
الْبَصَرُ خَاسِئًا وَهُوَ حَسِيرٌ (۳-۴ ملک)	آئے گی لیکن کوئی رخنہ نہ پا سکے گی۔

سما کا لفظ سما یسمو سے ہے جس کے معنی بلندی کے ہیں۔ یہ شامیانہ، جو ہمارے اوپر تنا ہوا نظر آتا ہے، قرآن اس کے عجائب اور اس کی نیرنگیوں کی طرف ہمیں متوجہ کرتا ہے اور ان سے جن واضح نتائج کی طرف رہبری ہوتی ہے ان کو قبول کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ اس کائنات کے مشاہدات سے متعلق قرآن کا مستقل اصول یہ ہے کہ جو چیزیں ہماری عام نگاہوں سے مخفی ہیں یا جو صرف گمان اور قیاس پر مبنی ہیں یا جو صرف خورد بینوں اور دور بینوں کی مدد سے ہی دیکھی جا سکتی ہیں، قرآن ان سے تعرض نہیں کرتا۔ اس لیے کہ ان میں بہت کچھ نزاع اور اختلاف کی گنجائش نکل سکتی ہے۔ قرآن ہمیں صرف انھی حقائق کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہے جن میں کسی انصاف پسند کے لیے کسی نزاع اور اختلاف کی گنجائش نہ ہو۔

آسمان کے حقائق کی طرف توجہ دلانے میں بھی قرآن نے یہی روش اختیار کی ہے۔ ان باتوں کی طرف توجہ دلا دی ہے جن کو ثابت کرنے کے لیے صرف توجہ دلا دینا ہی کافی ہے۔ البتہ یہ اشارہ کر دیا ہے کہ یہ آسمان سات ہیں تاکہ انسان اس غلط فہمی میں نہ مبتلا ہو جائے کہ خدا کی خدائی بس اس نظر آنے والی چھت اور ان چمکنے والے ستاروں ہی تک محدود ہے بلکہ اس پر واضح رہے کہ اس کے علاوہ تفتیش و تحقیق کی جولانیوں کے لیے ان ستاروں سے آگے اور بھی میدان ہیں۔

۲۰۔ مجموعہ آیات ۲۱-۲۹ میں مطالب کی ترتیب

مذکورہ بالا مجموعہ آیات میں جو باتیں جس ترتیب کے ساتھ کہی گئی ہیں پہلے ہم اجمال کے ساتھ ان کو اپنے الفاظ میں پیش کرتے ہیں اس کے بعد ان خاص خاص چیزوں سے بحث کریں گے جو وضاحت اور تفصیل کی محتاج ہیں۔

اس مجموعہ کی ابتدائی آیات میں بنی اسمٰعیل کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت قبول کرنے اور قرآن پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے۔ انداز کلام اس بات کو ظاہر کر رہا ہے کہ یہ خدا کی بندگی کی دعوت ہے اور جو خدا کی بندگی کرنا چاہتا ہے اس کے لیے واحد رستہ یہ ہے کہ وہ بندگی کی اس دعوت کو قبول کرے۔ اس میں ضمناً اس بات کی طرف بھی اشارہ ہو گیا ہے کہ جس طریقہ پر وہ خدا کی بندگی کر رہے ہیں یہ خدا کی بندگی نہیں ہے اس لیے کہ انھوں نے اس بندگی میں دوسروں کو بھی شریک کر رکھا ہے۔ حالانکہ اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کائنات میں اس کے تصرفات اس طرح بیان کیے گئے ہیں جس سے اس کی توحید ثابت ہوتی ہے۔ اس کے بعد ان سے یہ کہا گیا ہے کہ اگر اس دعوت کو قبول کرنے میں تم اس لیے ہچکچا رہے ہو کہ تمہیں اس قرآن کے اللہ کی طرف سے ہونے میں شک ہے، تمہارے خیال میں یہ خود پیش کرنے والے یا ان کے کسی مددگار کی تصنیف ہے تو اس کا فیصلہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ تم بھی اس کی سورتوں کی طرح کی کوئی سورہ تصنیف کر کے پیش کر دو۔ اس سے اس کے منزل من اللہ ہونے کا دعویٰ خود بخود باطل ہو جائے گا، اس کام میں تم اپنے شاعروں، ادیبوں، خطیبوں، کاہنوں، جنّاتوں اور دیویوں دیوتاؤں میں سے جس کی چاہو مدد بھی حاصل کر سکتے ہو۔

اس کے بعد اس انجام سے ڈرایا گیا ہے جس سے وہ لوگ دوچار ہوں گے جو اس قرآن کا جواب پیش کرنے سے تو قاصر ہیں لیکن اس کے منزل من اللہ ہونے کے دعوے کو جھٹلا رہے ہیں اور ساتھ ہی ان لوگوں کو جنت کی بشارت دی گئی ہے جو قرآن کی دعوت قبول کر کے ایمان اور عمل صالح کی روش اختیار کر لیں گے۔

جنت کی نعمتوں کے سلسلہ میں خاص بات جو یہاں کہی گئی ہے اور جو خاص توجہ کے لائق ہے وہ یہ ہے کہ جب جنت کی نعمتیں اہلِ جنت کے سامنے پیش کی جائیں گی تو وہ اس بات پر خوش ہوں گے کہ جو نعمتیں انھیں یہاں مل رہی ہیں وہ ان سے پہلے سے آشنا ہیں۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ قرآن کے منکرین تو قرآن کو آج ایک من گھڑت افسانہ سمجھ رہے ہیں لیکن ایک دن وہ بھی آنے والا ہے جب پردہ اٹھے گا اور قرآن کی ایک ایک بات کی صداقت اس طرح سامنے آئے گی کہ اہلِ ایمان ہر ملنے والی نعمت پہ خوشی سے باغ باغ ہوں گے کہ الحمدللہ قرآن کی بدولت اس جنت اور اس کی نعمتوں کی سیر ہمیں دنیا ہی میں کرا دی گئی تھی۔

اس کے بعد سلسلۂ کلام کے بیچ میں ایک مناسب موقع تنبیہ بطور جملۂ معترضہ کے آگئی ہے، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسماعیل کو متنبہ فرمایا ہے کہ یہ جنت اور اس کی نعمتوں کا جو ذکر ہوا ہے یہ بہرحال بشکلِ تمثیل ہے کیوں کہ اس دنیا میں تمھیں جنت اور دوزخ سے متعلق جو بات بھی سمجھائی جاسکتی ہے تمثیل ہی کے ذریعہ سے سمجھائی جاسکتی ہے اور اللہ تعالیٰ کو تمھارا سمجھانا اس قدر مطلوب و محبوب ہے کہ وہ ہر اس تمثیل کو تمھاری تعلیم کا ذریعہ بناتا ہے جس سے حقیقت تمھارے ذہن نشین ہوسکے، عام اس سے کہ یہ تمثیل کسی مکھی کی ہو یا مچھر کی۔ جو لوگ علم اور حقیقت کے جویا ہوتے ہیں وہ ان تمثیلات کی قدر کرتے ہیں اور ان سے ان کے علم میں اضافہ ہوتا ہے لیکن جو ضلالت کے طالب ہوتے ہیں وہ ان تمثیلوں کا مذاق اڑاتے ہیں اور ان کے سبب سے گمراہی میں پڑ جاتے ہیں۔ پھر اشارۃً چند لفظوں میں یہ بھی بتا دیا ہے کہ فلاں فلاں صفات کے لوگ ہیں جو ان تمثیلات سے علم و معرفت کے بجائے ضلالت اور گمراہی حاصل کرتے ہیں۔ یہ تمام صفات یہود پر چسپاں ہوتی ہیں۔ اس طرح گویا بنی اسماعیل کو متنبہ کیا گیا کہ نہ تو تم خود تمثیلات کے بارے میں اس قسم کی بیہودہ حجت طرازی کا مذاق اپنے اندر پرورش کرنا اور نہ یہود کی شہ سے فتنہ جوئی کی اس بیماری میں مبتلا ہونا ورنہ یاد رکھو کہ پرائے شگون پر تم اپنی ناک کٹوا بیٹھوگے۔

اس جملۂ معترضہ کے بعد کَیْفَ تَکْفُرُوْنَ سے پھر وہ دعوت سامنے آگئی ہے جو اُعْبُدُوْا رَبَّکُمْ سے شروع ہوئی تھی اس کے بعد قیامت کی دو دلیلیں بیان ہوئی ہیں۔ ایک اس پہلو سے کہ جس خدا نے تمھیں عدم سے وجود بخشا وہ تمھیں مرنے کے بعد دوبارہ آخر کیوں نہیں پیدا کرسکتا؟ دوسری ربوبیت کے پہلو سے جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ یہ پورا سلسلۂ کلام اوپر سے بھی مربوط ہے اور اس کی ہر کڑی باہم دگر بھی ایک دوسری سے جڑی ہوئی ہے۔ پہلے خدا کی بندگی کی دعوت ہے اور اس کے ساتھ توحید کا بیان ہے کیوں کہ خدا کی بندگی بغیر توحید کے بے معنی ہے۔ اس کے بعد رسالت پر ایمان لانے کی دعوت ہے اور اس کی دلیل کے طور پر قرآن حکیم کے معجزے کو پیش کیا گیا ہے۔ پھر انکار کی سزا اور ایمان کی جزا بیان ہوئی

ہے پھر بر سبیلِ تنبیہ آگاہ کیا گیا ہے کہ جزا اور سزا کا جو بیان بطور تمثیل ہوا ہے یہود کی پیروی میں اس کا مذاق اڑانے کی کوشش میں نہ لگ جانا۔ پھر قیامت پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے اور اس دعوت کے پہلے ہی لفظ سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ جو لوگ اللہ پر ایمان کے مدعی ہوں لیکن وہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کو ناممکن مانتے ہوں وہ درحقیقت خدا کے ماننے والے نہیں بلکہ اس کے منکر ہیں۔

۱۲۔ بعض دلائل کی وضاحت

اس مجموعۂ آیات میں اسلام کے تینوں بنیادی عقائد ــــ توحید، رسالت اور معاد کی بعض دلیلیں بیان ہوئی ہیں۔ اب ہم ان کو واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔

توحید کی دلیل

پہلی دلیل توحید کی بیان ہوئی ہے۔ وہ یہ ہے:

الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ	جس نے تمھارے لیے زمین کو بچھونا اور آسمان کو
بِنَآءً وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ	چھت بنایا اور آسمان سے پانی برسایا اور اس سے
بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّکُمْ فَلَا تَجْعَلُوْا	پھل پیدا کیے تمھاری روزی کے لیے تو تم اللہ
لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۲۲۔ بقرہ)	کے ہمسر نہ ٹھہراؤ درآں حالے کہ تم جانتے ہو۔

توحید کی یہ دلیل اس توافق اور ہم آہنگی کے پہلو سے ہے جو اس کائنات کے تمام اضداد کے اندر پائی جاتی ہے۔ اس کائنات میں ایک طرف تو زمین کے مقابل میں آسمان، شب کے مقابلے میں روز، نور کے مقابل میں ظلمت، سردی کے مقابل میں گرمی اور عورت کے مقابل میں مرد کا وجود پایا جاتا ہے جس سے بظاہر یہ گمان ہوتا ہے کہ شاید یہ کائنات اضداد اور باہم نبرد آزما قوتوں اور طاقتوں کی ایک رزمگاہ ہے۔ چنانچہ یہی دھوکا بعض قوموں کو ہوا جس کے سبب سے انھوں نے نور اور ظلمت، نیکی اور بدی کے الگ الگ خالق ٹھہرا لیے۔ اسی قسم کی غلط فہمی میں مبتلا ہو کر اہلِ عرب بھی زمین کے لیے الگ اور آسمان کے لیے الگ دیوتا مانتے تھے۔ قرآن مجید نے اسی مغالطہ کو یہاں رفع کیا ہے کہ اس کائنات میں جو تضاد نظر آتا ہے وہ محض ظاہری ہے۔ غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ اس کے تمام اضداد میں نہایت گہرے قسم کا توافق ہے۔ زمین تمھارے لیے بستر کی طرح بچھی ہوئی ہے اور آسمان تمھارے اوپر شامیانے کی طرح تنا ہوا ہے۔ پھر دیکھو آسمان سے پانی برستا ہے اور اس پانی سے زمین میں طرح طرح کے پھل پیدا ہوتے ہیں اور یہ پھل تمھارے لیے غذا کا کام دیتے ہیں۔ زمین اور آسمان کے درمیان اس طرح کے توافق کے ہوتے ہوئے یہ کس طرح باور کرتے ہو کہ زمین کے اندر کسی اور دیوتا کا ارادہ کار فرما ہے اور آسمان میں کسی اور کی خدائی چل رہی ہے۔ مختلف ارادوں کے تصرفات میں یہ موافقت اور یہ سازگاری کس طرح پیدا ہو سکتی ہے کہ آسمان اور زمین دونوں مل کر ایک گہوارہ بنائیں اور اس گہوارے میں انسان کی اس طرح پرورش کریں جس طرح ماں بچے

کی پرورش کرتی ہے ؟ اس اختلاف کا نتیجہ تو یہ ہونا تھا کہ یہ دونوں خود بھی درہم برہم ہو کے رہ جاتے اور ان کے ساتھ وہ بھی پس جاتے جو اس چکی کے دونوں پاٹوں کے بیچ میں آ جاتے۔

یہ دلیل بیان کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ تم خدا کا کوئی ہمسر نہ ٹھہراؤ درآں حالے کہ تم جانتے ہو۔ "تم جانتے ہو" کا مطلب یہ ہے کہ تم اس بات کو مانتے ہو کہ زمین کا اس صورت پر پیدا ہونا اور آسمان کا اس شکل میں وجود میں آنا خدا ہی کی قدرت سے ہوا ہے۔ ان میں سے کسی چیز کو بھی خدا کے سوا کسی اور نے نہیں بنایا ہے۔ اس اقرار کے بعد آسمان و زمین کے انتظام میں کسی کو خدا کا شریک ماننا ایک ایسی بے جوڑ بات ہے جس کا بے جوڑ ہونا بالکل واضح ہے۔ قرآن نے یہاں اسی چیز کی طرف اشارہ کیا ہے۔

یہ بات یہاں ملحوظ رہنی چاہیئے کہ مشرکینِ عرب، جیسا کہ ہم نے عرض کیا ہے، خدا کے منکر نہیں تھے۔ وہ خدا کو مانتے تھے البتہ وہ اس کے شریک ٹھہراتے تھے۔ اس وجہ سے ان کے سامنے خدا کے وجود کو ثابت کرنے کی ضرورت نہیں تھی بلکہ صرف شرک کی تردید کی ضرورت تھی۔ چنانچہ یہاں دلیل اثبات باری کی نہیں دی گئی ہے بلکہ توحید کی دی گئی ہے۔ لیکن اس دلیل کو پیش کرنے کا انداز ایسا اختیار کیا گیا ہے جس سے ایک خالق اور پروردگار کا ثبوت اس سے آپ سے آپ ہو رہا ہے۔

یہاں اس دلیل کی اسی قدر وضاحت پر ہم اکتفا کرتے ہیں۔ آگے مختلف شکلوں اور اسلوبوں میں یہ دلیل آئے گی اور ہر جگہ موقع کے لحاظ سے اس کی وضاحت ہوگی۔ یہ دلیل ہم نے پوری تفصیل کے ساتھ اپنے رسالہ حقیقت توحید میں بھی بیان کی ہے۔ جو لوگ مزید وضاحت کے طالب ہوں اس رسالہ کو پڑھیں۔

رسالت کی دلیل

دوسری دلیل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے اثبات کی دی گئی ہے۔ وہ یہ ہے:

وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِنْ مِثْلِهِ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا وَلَنْ تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ (۲۳-۲۴)	اور اگر تم اس چیز کی طرف سے شک میں ہو جو ہم نے اپنے بندے پر اتاری ہے تو پیش کرو اس کے مانند کوئی سورہ اور بلا لو اپنے حمایتیوں کو بھی اللہ کے سوا، اگر تم سچے ہو پس اگر تم یہ نہ کر سکو اور ہرگز نہ کر سکو گے تو اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن بنیں گے آدمی اور پتھر۔ وہ کافروں کے لیے تیار کی ہوئی ہے۔

قرآن کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دعویٰ یہ تھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے جو اس نے اپنے مقرب فرشتے — حضرت جبریلؑ — کے ذریعہ سے بہ شکل وحی آپ پر اتاری ہے۔ آپ اس کتاب کو اپنی رسالت کے ثبوت میں پیش فرماتے تھے۔ مشرکین عرب آپ کے اس دعوے کے مخالف تھے اور ان کی اس مخالفت میں یہود بھی ان کے ہم نوا تھے بلکہ درپردہ وہی اس مخالفت کو اصلی ہوا دینے والے تھے۔ یہ

لوگ اس مخالفت میں مختلف قسم کی باتیں کہتے تھے۔ کبھی کہتے کہ یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خود اپنی تصنیف ہے جس کو یہ ہمارے اوپر اپنی نبوت کی دھونس جمانے کے لیے خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں، کبھی کہتے کہ کچھ لوگ ان کے شریک سازش ہیں اور وہ اس کتاب کی تیاری میں ان کی مدد کرتے ہیں، کبھی کہتے ہیں کہ جس طرح شاعروں اور کاہنوں پر جنات القا کرتے ہیں۔ اسی طرح ان پر بھی کوئی جن یہ کلام القا کرتا ہے، کبھی دعویٰ کرتے کہ یہ کلام کوئی مافوق کلام نہیں ہے، ہم بھی چاہیں تو اس قسم کا کلام بڑی آسانی کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں۔ اس طرح کی باتوں سے وہ اس کے ایک خدائی کلام ہونے کو جھٹلانا چاہتے تھے تاکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوے کی تردید ہو سکے اور یہ کتاب آپ کی نبوت و رسالت کی دلیل نہ بن سکے۔

ان ساری باتوں کے جواب میں یہ فرمایا گیا کہ اگر تمھیں اس طرح کے شکوک و شبہات ہیں تو اس کا فیصلہ بڑی آسانی کے ساتھ یوں ہو سکتا ہے کہ تم بھی اس کے مانند کوئی سورہ پیش کر دو۔ اگر تم نے اس کے مانند ایک سورہ بھی پیش کر دی تو ثابت ہو جائے گا کہ تمھارے خیالات صحیح ہیں اور قرآن کا دعویٰ غلط ہے۔

پھر آخری اتمام حجت کے طور پر قرآن نے اپنی اس تحدی کے ساتھ تین باتیں شامل کر دیں۔

ایک یہ کہ اس کتاب کے مانند کوئی ایک ہی سورہ پیش کر دو۔ واضح رہے کہ اس سے پہلے ان لوگوں سے یہ بات کہی گئی تھی کہ اس کے مانند کوئی کتاب پیش کرو اور پھر یہ بات کہی گئی کہ اس کے مانند دس سورتیں پیش کرو۔ جب وہ ان دونوں مطالبوں میں سے کوئی بھی پورا کرنے کی ہمت نہ کر سکے تو آخری بات یہ کہہ دی گئی کہ چلو، ایک ہی سورہ اس کے مانند پیش کر کے دکھاؤ۔

دوسری بات یہ کہی گئی کہ اگر تمھارے لیے تنہا اپنے بل بوتے پر یہ کام مشکل ہو تو تمھارے پاس ادیب بھی ہیں، خطیب بھی ہیں، شاعر بھی ہیں، کاہن بھی ہیں، جنات بھی ہیں، شیطان بھی ہیں اور تمھارے بہت سے دیوی دیوتا بھی ہیں، قرآن کا مقابلہ کرنے کے لیے تم ان سب کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ اگر ان سب کی مدد بھی تمھاری اس مشکل کو آسان نہ کر سکے تو پھر اس کے سوا چارہ نہیں کہ اس قرآن کو خدا کی کتاب مانو اور اس کو جھٹلانے کی کوشش میں بے فائدہ اپنی قوت ضائع نہ کرو۔

تیسری بات یہ کہی گئی کہ ان میں سے کوئی ایک بات بھی نہ تو تم آج کر سکتے ہو اور نہ کبھی آئندہ کر سکو گے۔ اس وجہ سے اس سعی لاحاصل میں اپنی دنیا اور آخرت برباد کرنے کے بجائے اس عذاب سے بچنے کی فکر کرو جس سے اس کتاب کی تکذیب پر جمے رہنے کی صورت میں لازماً دوچار ہونا پڑے گا۔

قرآن کے اس چیلنج کے اصلی مخاطب اگرچہ اہل عرب تھے، غیر اہل عرب کے لیے اس قسم کے چیلنج کا سوال نہیں پیدا ہوتا تھا۔ لیکن قرآن کے ہر مخالف اور رسالت محمدی کے ہر منکر کے لیے، خواہ وہ عرب سے تعلق رکھتا ہو یا عجم سے، قرآن کے زمانۂ نزول سے لے کر آج تک، یہ چیلنج موجود ہے جس

کا جی چاہے وہ اپنے زور اور اپنی قابلیت کا امتحان کرلے، اسے خود اندازہ ہو جائے گا کہ وہ قرآن کی کسی چھوٹی سے چھوٹی سورہ کے مانند بھی کوئی کلام پیش کر سکتا ہے یا نہیں۔

قیامت کی دلیل

تیسری دلیل قیامت کی دی گئی ہے، وہ اس طرح بیان ہوئی ہے:۔

كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا	تم اللہ کا کس طرح انکار کرتے ہو اور حال یہ ہے
فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ	کہ تم مردہ تھے اور اس نے تم کو زندہ کیا، پھر وہ تمھیں
ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ○ هُوَ الَّذِي خَلَقَ	مارتا ہے، پھر تم کو زندہ کرے گا پھر تم اس کی طرف
لَكُمْ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ	لوٹائے جاؤ گے۔ وہی ہے جس نے تمھارے لیے
اسْتَوٰى اِلَى السَّمَاءِ فَسَوّٰهُنَّ سَبْعَ	پیدا کیا وہ سب کچھ جو زمین میں ہے۔ پھر اس نے
سَمٰوٰتٍ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ	آسمان کے بنانے کا قصد کیا اور ہموار کر دیے سات
عَلِيمٌ ○ (۲۸-۲۹ بقرہ)	آسمان اور وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔

یہاں کفر سے مراد خدا کا انکار نہیں بلکہ جیسا کہ ہم اوپر واضح کر چکے ہیں، قیامت کا انکار ہے۔ کیوں کہ قیامت کا انکار درحقیقت خدا کی تمام اعلیٰ صفات۔ قدرت، ربوبیت، حکمت اور علم۔ کا انکار ہے۔ جو شخص ان صفات کے بغیر خدا کو مانے اس کا خدا کو ماننا اور نہ ماننا دونوں برابر ہے۔ اس وضاحت کے بعد اب دیکھیے یہاں قیامت کی کیا دلیل بیان ہوئی ہے۔

پہلے معاد کے ممکن ہونے کی دلیل دی گئی ہے۔ یہ وہی عام عقلی اور فطری دلیل ہے جو قرآن مجید میں مختلف پیرایوں اور اسلوبوں میں بیان ہوئی ہے کہ جب تم یہ مانتے ہو کہ خدا نے تم کو عدم سے وجود بخشا اور یہ بھی دیکھتے ہو کہ وہی خدا ہے جو تم کو زندگی کے بعد موت دیتا ہے تو پھر اس بات کو کیوں ناممکن سمجھتے ہو کہ وہ تمھیں دوبارہ اٹھا کھڑا کرے، جس کے لیے پہلی بار پیدا کرنا ممکن ہوا آخر اس کے لیے دوبارہ پیدا کر دینا کیوں ناممکن ہو جائے گا؟

لیکن کسی چیز کے ممکن ہونے سے یہ لازم نہیں ہو جاتا کہ وہ ضرور واقع بھی ہو کے رہے، قیامت کا واقع ہونا ممکن سہی لیکن آخر اس کی ضرورت کیا ہے؟ اس کا جواب یہ دیا کہ جس خدا نے تمھاری پرورش کے لیے یہ سارا جہان بنایا اور اپنی پروردگاری کی یہ شانیں دکھائیں، جس کی قدرت اس کائنات کے ہر گوشہ سے نمایاں ہو رہی ہے اور جس کی حکمت کی شہادت ذرہ ذرہ سے مل رہی ہے، کس طرح ممکن ہے کہ وہ تم کو پیدا کر کے یوں ہی چھوڑ دے اور تمھارے نیکوں اور بدوں میں کوئی امتیاز نہ کرے۔ اگر وہ ایسا کرے تو اس کی وہ ربوبیت بے معنی ہو جاتی ہے جس کی شہادت اس زمین کے ہر گوشہ سے مل رہی ہے، وہ قدرت و حکمت بے مقصد ہو جاتی ہے جس کی گواہی یہ آسمان دے رہا ہے، اور وہ محیط کل علم بے نتیجہ ہو جاتا ہے جس سے اس آسمان و زمین کے خالق کو لازماً متصف ہونا چاہیے اور وہ اس سے متصف ہے بھی۔

قیامت کی یہ دلیل اجمال و تفصیل کے مختلف پیرایوں میں قرآن میں بار بار آئے گی اس وجہ سے یہاں ہم صرف اجمالی اشارہ پر کفایت کرتے ہیں۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوئی کہ اگرچہ بنی اسماعیل سے یہ تخاطب ضمنی طور پر محض برسبیل التفات تھا تاہم ان کے سامنے دعوت کے تینوں اصولی اجزا، توحید، رسالت اور معاد — ان کے بنیادی دلائل کے ساتھ رکھ دیے گئے۔

۲۲۔ قرآن مجید کی عظمت کے دو پہلو

تمام جن و بشر قرآن کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہیں

ان آیات میں قرآن مجید پر ایمان لانے کی دعوت دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے اس کی عظمت کے دو پہلو یہاں بے نقاب کیے ہیں۔ ایک پہلو کی طرف ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں یعنی یہ کہ تمام جن و بشر اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہیں۔ قرآن کی عظمت کا یہ پہلو اس وقت بھی واضح تھا جب کہ یہ نازل ہو رہا تھا کیوں کہ جو لوگ اس کو کسی جن یا البشر کا کلام سمجھتے تھے، اس کی تردید کی انتہائی خواہش رکھنے کے باوجود اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز رہے۔ اور آج بھی یہ واضح ہے جب کہ اس کے نزول پر پوری چودہ صدیاں گزر چکی ہیں لیکن اس کے کٹر سے کٹر مخالف بھی کوئی ایسی چیز پیش نہ کر سکے جس سے قرآن کے اس دعوائے یکتائی کی تردید ہو سکے۔

قرآن کے حقائق مجاز کے پیرایے میں

اس کی عظمت کے ایک دوسرے پہلو کی طرف یہاں یوں اشارہ کیا گیا ہے کہ جس قرآن کو اس کے مخالفین آج ایک من گھڑت چیز سمجھتے اور اس کی تمثیلات کی آڑ لے کر اس کو جھٹلاتے ہیں، ایک دن ایسا بھی آئے گا جب اس پر ایمان لانے والے جنت میں بیٹھے ہوئے جنت کی ایک ایک نعمت پر خوش ہو کر کہیں گے کہ الحمد للہ ہمیں قرآن نے ان ساری نعمتوں کے مزوں سے پہلے ہی آشنا کر دیا تھا اور آج ہم ان کی اصل حقیقت سے متمتع ہو رہے ہیں۔

اس سے اس بات کا اشارہ نکلتا ہے کہ جو شخص قرآن پر سچا ایمان رکھتا ہے اور اس کی باتوں کی روحانیت کو سمجھتا ہے وہ درحقیقت اسی دنیا میں بیٹھے ہوئے جنت کی نعمتوں کا بھی ایک جلوہ دیکھ لیتا ہے اور دوزخ کے عذاب کا بھی ایک نقشہ اس کے سامنے آجاتا ہے۔ پھر اس بات کا بھی اشارہ نکلتا ہے کہ قرآن نے جن نیکیوں کا حکم دیا ہے درحقیقت انھی کی لذتیں ہیں جو اپنی حقیقی شکل و صورت میں جنت میں اہل ایمان کے سامنے آئیں گی۔ اسی طرح جن برائیوں سے قرآن نے روکا ہے انھی کی تلخیاں ہیں جو دوزخ میں اپنی اصلی شکل میں مجرموں کے سامنے ظاہر ہوں گی۔ فرق جو کچھ ہو گا وہ مجاز اور حقیقت کا ہو گا۔ یہاں جو کچھ بتایا گیا ہے وہ مجاز اور تمثیل کے رنگ میں ہے اس لیے کہ آخرت کے حقائق کے لیے یہاں مجاز ہی کا پیرایہ اختیار کیا جا سکتا ہے لیکن آخرت میں سارے پردے اٹھ جائیں گے اور باریک سے باریک حقیقت بھی بالکل بے پردہ ہو کر نگاہوں کے سامنے آجائے گی۔

اہلِ جنت کی یہ بات کہ جب ان کو جنت کی کوئی نعمت ملے گی تو وہ کہیں گے کہ یہ وہی چیز ہے جو ہمیں پہلے یعنی دنیا میں ملی تھی، اس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ اہل ایمان نیکیوں کی لذت و حلاوت سے بقدرِ استعداد اس دنیا میں بھی محظوظ ہوتے ہیں لیکن یہاں چونکہ محسوسات کے پردے پڑے ہوئے ہوتے ہیں اس وجہ سے ان کی حقیقی لذت بے نقاب نہیں ہو پاتی۔ انبیاء علیہم السلام اور عارفین سے بہت سی ایسی باتیں منقول ہیں جن سے اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ ایمان میں، اسلام میں، روزے میں، نمازمیں، انفاق میں، ایثار میں اور نیکی کے دوسرے کاموں میں جو لذتیں اور حلاوتیں پنہاں ہیں ان سے وہ اس دنیا میں بھی لذت یاب ہوتے رہے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے"۔ اسی طرح حضورؐ کا ارشاد ہے کہ "اگر لوگ جان جائیں کہ عشا کی نماز میں کیا چیز پوشیدہ ہے تو وہ اس کے لیے پیٹوں کے بل رینگتے ہوئے بھی پہنچیں"۔ اسی سے ملتی جلتی باتیں صحابہ رضی اللہ عنہم اور بہت سے عارفین سے بھی منقول ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ ان لذتوں سے اسی دنیا میں آشنا ہو چکے ہوں گے جب یہی لذتیں اپنی حقیقی شکل و صورت میں ان کے سامنے آخرت میں ظاہر ہوں گی تو وہ یہ تو محسوس کریں گے ہی کہ ان کی جھلکیاں وہ اس سے پہلے بھی دیکھ چکے ہیں۔ اس سے پہلے ان کو ان جھلکیوں سے آشنا کرانے والی اگر کوئی چیز ہو سکتی ہے تو وہ قرآن ہی ہو سکتا ہے۔ لیکن جو قرآن یہ پھولے کر نازل ہوا ہے، جو دنیا میں آخرت کا آئینہ بن کر اترا ہے، جس کی آیتوں اور سورتوں میں جنت کی یہ بہاریں چھپی ہوئی ہیں، بے بصیرت لوگ اس کی یہ قدر کر رہے ہیں کہ اس کی نہایت حقیقت افروز تمثیلات کو بہانہ بنا کر اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ حالاں کہ اگر وہ اس کا ایک جلوہ بھی دیکھ پاتے تو اس کی سیر سے کبھی آسودہ نہ ہوتے۔

۲۳۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۳۰-۳۹

بنی اسماعیل کو مذکورہ بالا دعوت دینے اور ان کو یہود کی چالوں سے ہوشیار رہنے کی تاکید کرنے کے بعد آگے کی دس آیتوں (۳۰-۳۹) میں آدمؑ کی خلافت اور شیطان کی طرف سے اس کی مخالفت کی سرگزشت بیان ہوئی ہے۔ یہ سرگزشت اپنے اندر بہت سے حقائق رکھتی ہے جن کی تفصیل تو اپنے اپنے مواقع پر آگے آئے گی لیکن یہاں بطور تمہید اس کے اس پہلو کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے جس پہلو سے یہ پچھلے سلسلۂ کلام سے مربوط ہوتی ہے۔

یہ سرگزشت ایک آئینہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اس ردِ عمل کی پوری تصویر دکھائی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور نزولِ قرآن سے یہود پر خصوصاً اور وقت کی بعض دوسری جماعتوں پر عموماً نمایاں ہوا۔ یہود اپنے حسد اور تکبر کے سبب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن بن گئے اور برابر

اس دشمنی پر جمے رہے۔ اس کے برعکس دوسرے بہت سے لوگ، جو حسد اور تکبر کی بیماری میں مبتلا نہیں تھے، اگرچہ اوّل اوّل حقیقت کے اچھی طرح واضح نہ ہونے کے باعث بعض شبہات میں مبتلا ہوئے لیکن جوں جوں ان کے شبہات دور ہوتے گئے وہ دائرۂ اسلام میں داخل ہوتے گئے۔ قرآن نے یہ دکھایا ہے کہ یہ ردِعمل بہت کچھ مشابہ ہے اس ردِعمل سے جو آدمؑ کی خلافت کے فیصلہ سے ابلیس اور فرشتوں پر ہوا تھا۔ جب اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو خلیفہ بنانے کا فیصلہ کیا اور اس کی خبر فرشتوں کو دی تو اوّل اوّل انھیں بھی اس فیصلہ کے بارے میں بعض شبہات پیش آئے اور انھوں نے اپنے یہ شبہات اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش بھی کیے لیکن وہ شبہات محض اس وجہ سے پیدا ہوئے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی پوری اسکیم ان پر واضح نہیں ہوئی تھی۔ جوں ہی پوری اسکیم ان کے سامنے آگئی ان کے سارے شبہات دور ہو گئے اور وہ آدمؑ کی خلافت پر پوری طرح راضی اور مطمئن ہو گئے۔ برعکس اس کے ابلیس کو آدمؑ کی خلافت پر جو اعتراض تھا وہ حسد اور تکبر کی بنا پر تھا، اس نے خیال کیا کہ وہ آگ سے پیدا ہوا ہے اور آدمؑ مٹی کا ایک پتلا ہے پھر اس کے مقابلہ میں آدمؑ کو خلافت کا یہ منصب کیوں ملے اور یہ نسلی برتری رکھتے ہوئے وہ آدمؑ کو سجدہ کیوں کرے؟

قرآن نے دکھایا ہے کہ بالکل اسی سرگزشت کا اعادہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نبوت و رسالت کے معاملہ میں ہو رہا ہے۔ جو لوگ حق طلب اور معقولیت پسند ہیں ان کو اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رسالت یا قرآن کے کسی پہلو میں تردد تھا تو وہ حق کے واضح ہو جانے کے بعد دور ہو گیا ہے یا دور ہو جائے گا لیکن یہود کی ساری مخالفت حسد اور تکبر پر مبنی ہے، وہ نسب کے اعتبار سے بھی اپنے آپ کو بنی اسماعیل کے مقابل میں افضل سمجھتے ہیں اور اپنی قدیم دینی سیادت و پیشوائی کے غرّہ میں مذہبی اعتبار سے بھی اپنے آپ کو امّی عربوں کے بالمقابل برتر خیال کرتے ہیں۔ اس وجہ سے ان پر یہ بات بڑی شاق گزر رہی ہے کہ وہ ایک امّی نبیؐ کی رسالت کا اقرار کر کے اپنے اوپر امّیوں کی سیادت تسلیم کر لیں اور دنیا کی امامت کا جو منصب ان کو اب تک حاصل رہا ہے اس سے دستبردار ہو جائیں۔

اس تصویر میں قرآن نے یہود کا اصلی مقام متعین کر دیا ہے کہ ان کا پارٹ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رسالت کی مخالفت میں بعینہٖ وہی ہے جو ابلیس کا پارٹ حضرت آدمؑ کی مخالفت میں رہا ہے۔ دونوں کی مخالفت کے اسباب و محرکات بالکل ایک ہی قسم کے ہیں۔ اشارۃً یہ بات بھی ظاہر کر دی ہے کہ دونوں کا انجام بھی ایک ہی ہوگا۔ جس طرح ابلیس کی مخالفت کے علی الرغم آدمؑ کی خلافت قائم ہو کے رہی اسی طرح یہود کی مخالفت کے علی الرغم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رسالت و نبوت بھی قائم ہو کے رہے گی۔

نیز اس بات کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے کہ کسی واقعی شبہ کی بنا پر کسی خلش کا پیدا ہو جانا یا کسی اعتراض کا اٹھانا کوئی معیوب بات نہیں ہے، نیک اور معقول لوگوں کے دلوں میں بھی اس طرح کی خلشیں پیدا ہو جاتی ہیں اور ان کے سبب سے کسی چیز پر وہ اعتراض بھی کر گزرتے ہیں لیکن ان کے اعتراض کے

پسِ پردہ چونکہ حسد یا تکبر کا کوئی داعیہ چھپا ہوا نہیں ہوتا اس وجہ سے جوں ہی ان کے شبہ کے اسباب دور ہوئے وہ پورے شرح صدر کے ساتھ امر حق کا اعتراف کر لیتے ہیں۔ یہ گویا ایک نہایت لطیف اسلوب سے ان لوگوں کے لیے ایک دعوتِ ایمان ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر اگرچہ ایمان تو نہیں لائے تھے لیکن ان کا ایمان نہ لانا کسی حسد اور تکبر کی بنا پر نہیں تھا بلکہ صرف اس وجہ سے تھا کہ آپ کے دعوے اور آپ کی دعوت کے بعض پہلو ابھی ان پر اچھی طرح روشن نہیں ہوئے تھے ـــــ اس سلسلۂ کلام کو سامنے رکھتے ہوئے اب آگے کی آیات کی تلاوت کیجیے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

آیات ۳۰-۳۹

وَاِذۡ قَالَ رَبُّكَ لِلۡمَلٰٓـئِكَةِ اِنِّىۡ جَاعِلٌ فِى الۡاَرۡضِ خَلِيۡفَةً ؕ قَالُوۡٓا اَتَجۡعَلُ فِيۡهَا مَنۡ يُّفۡسِدُ فِيۡهَا وَيَسۡفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحۡنُ نُسَبِّحُ بِحَمۡدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّىۡٓ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۳۰﴾ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمۡ عَلَى الۡمَلٰٓـئِكَةِ فَقَالَ اَنۡۢبِـئُوۡنِىۡ بِاَسۡمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴿۳۱﴾ قَالُوۡا سُبۡحٰنَكَ لَا عِلۡمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمۡتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَلِيۡمُ الۡحَكِيۡمُ ﴿۳۲﴾ قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنۡۢبِئۡهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡ ۚ فَلَمَّآ اَنۡۢبَاَهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡ ۙ قَالَ اَلَمۡ اَقُلۡ لَّكُمۡ اِنِّىۡٓ اَعۡلَمُ غَيۡبَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۙ وَاَعۡلَمُ مَا تُبۡدُوۡنَ وَمَا كُنۡتُمۡ تَكۡتُمُوۡنَ ﴿۳۳﴾ وَاِذۡ قُلۡنَا لِلۡمَلٰٓـئِكَةِ اسۡجُدُوۡا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوۡٓا اِلَّآ اِبۡلِيۡسَ ؕ اَبٰى وَاسۡتَكۡبَرَ وَكَانَ مِنَ الۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۳۴﴾ وَقُلۡنَا يٰٓـاٰدَمُ اسۡكُنۡ اَنۡتَ وَزَوۡجُكَ الۡجَـنَّةَ وَكُلَا مِنۡهَا رَغَدًا حَيۡثُ شِئۡتُمَا وَلَا تَقۡرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوۡنَا مِنَ الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۳۵﴾ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيۡطٰنُ عَنۡهَا فَاَخۡرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيۡهِ ۖ وَقُلۡنَا اهۡبِطُوۡا بَعۡضُكُمۡ

بِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ ﴿۳۶﴾ فَتَلَقَّىٰ آدَمُ مِن رَّبِّهِ كَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿۳۷﴾ قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا ۖ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۳۸﴾ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۳۹﴾

رکوع ۴

ترجمہ آیات ۳۰-۳۹

اور یاد کرو جب کہ تمھارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں، انھوں نے کہا کیا تو اس میں اس کو خلیفہ مقرر کرے گا جو اس میں فساد مچائے اور خونریزی کرے اور ہم تو تیری حمد کے ساتھ تیری تسبیح کرتے ہی ہیں اور تیری پاکی بیان کرتے ہی ہیں؟ اس نے کہا میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے اور اس نے سکھا دیئے آدم کو سارے نام، پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ اگر تم سچے ہو تو مجھے ان لوگوں کے ناموں سے آگاہ کرو۔ انھوں نے کہا کہ تو پاک ہے، ہمیں تو تو نے جو کچھ بتایا ہے اس کے سوا کوئی علم نہیں، بے شک تو ہی علم والا اور حکمت والا ہے۔ کہا اے آدم! ان کو بتاؤ ان لوگوں کے نام، تو جب اس نے بتائے ان کو ان لوگوں کے نام تو اس نے کہا کیا میں نے تم سے نہیں کہا کہ آسمانوں اور زمین کے بھید کو میں ہی جانتا ہوں اور میں جانتا ہوں اس چیز کو جس کو تم ظاہر کرتے ہو اور جس کو تم چھپاتے تھے۔ ۳۰-۳۳

اور یاد کرو جب کہ ہم نے کہا فرشتوں سے کہ آدم کو سجدہ کرو تو انھوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے۔ اس نے انکار کیا اور گھمنڈ کیا اور کافروں میں سے بن گیا۔ اور ہم نے کہا اے آدم تم اور

تمھاری بیوی دونوں رہو جنت میں اور اس میں سے کھاؤ فراغت کے ساتھ جہاں سے چاہو اور اس درخت کے پاس نہ پھٹکنا ورنہ ظالموں میں سے بن جاؤ گے۔ تو شیطان نے ان کو وہاں سے پھسلا دیا اور ان کو نکلوا چھوڑا اس عیش و آرام سے جس میں وہ تھے۔ اور ہم نے کہا کہ اترو تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے اور تمھارے لیے ایک وقت خاص تک زمین میں رہنا بسنا اور کھانا برتنا ہے۔ پھر آدم نے پا لیے اپنے رب کی طرف سے چند کلمات تو اس نے اس کی توبہ قبول کی۔ بے شک وہی توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ ہم نے کہا اترو یہاں سے سب تو اگر آئے تمھارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت تو جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے تو ان کے لیے نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ اور جو کفر کریں گے اور جھٹلائیں گے میری آیتوں کو وہی لوگ دوزخ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ ۳۹-۳۰

۴۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۳۰)

'اذ' کا محل استعمال

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ: عربی زبان میں جب کلام کا آغاز 'اذ' سے ہوتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس سے پہلے خیال کرو، تصور کرو، یاد کرو یا ان کے ہم معنی کوئی فعل یہاں محذوف ہے۔ عموماً اس کے بعد کسی ایسی ہی سرگزشت یا واقعہ کا حوالہ آتا ہے جو یا تو مخاطب کے علم میں ہو، یا خود متکلم اس کی قطعیت پر اس درجہ مطمئن ہو کہ ایک معلوم و معروف حقیقت کی حیثیت سے اس کا حوالہ دے سکے۔ یہاں اگرچہ آدم، ملائکہ اور ابلیس سے متعلق ایک ایسے ماجرے کا حوالہ دیا گیا ہے جو عالم غیب میں پیش آیا ہے اور جس کا علم خدا کے سوا کسی کو بھی نہیں ہے۔ لیکن مخاطب یہاں اوّل تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جن کے لیے زبان وحی کی ہر بات ایک امر واقعی اور ایک حقیقت ثابتہ کی حیثیت رکھتی تھی، ثانیاً اس سرگزشت کا اصلی رخ، جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے، یہود کی طرف ہے اور یہود تورات کے ذریعہ

سے اس ماجرے سے واقف تھے اگرچہ انھوں نے تحریف کر کے اس کی اصلی شکل بہت کچھ بدل ڈالی تھی۔

'ملٰئِکۃ' کا مفہوم

مَلٰٓئِکَۃِ: مَلَک کی جمع ہے۔ عربی زبان میں اُلوکہ کے معنی پیغام کے آتے ہیں اور مَلَک (جس کی اصل ملأک ہے) کے معنی رسول اور پیغام بر کے ہیں۔ یہ لفظ ان روحانی پیغام بروں کے لیے مخصوص ہے جن کو ہم اپنی زبان میں فرشتہ کہتے ہیں۔ فرشتے اللہ تعالیٰ اور اس کی دوسری مخلوقات کے درمیان قابلِ اعتماد واسطہ ہیں۔ یہ اپنی روحانیت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ سے بھی غایت درجہ قرب واتصال رکھتے ہیں اور مخلوق ہونے کے سبب سے مخلوقات سے بھی نسبت اور تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے اندر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والے انوار و ترشحات کے بلاواسطہ قبول کرنے کی صلاحیت بھی ہے اور یہ ان انوار و ترشحات کو اللہ تعالیٰ کے بندوں تک منتقل کرنے کی قابلیت بھی رکھتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے نبیوں اور رسولوں کے پاس وحی بھی لاتے ہیں اور اس کی مخلوق کے اندر اس کے احکام کی تنفیذ بھی کرتے ہیں۔ قرآن میں ان کی جو صفات بیان کی گئی ہیں وہ تمام تر ایک ذی عقل، ذی ارادہ اور ذی شعور مخلوق کی نہایت اعلیٰ اور پاکیزہ صفات ہیں۔ اس وجہ سے جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ مجرد قوتیں ہیں جن کو ملٰئکہ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے ان کا خیال صحیح نہیں ہے۔

'خلیفۃ' کا مفہوم

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً: خلیفہ اس کو کہتے ہیں جو کسی کے بعد اس کے معاملات سرانجام دینے کے لیے اس کی جگہ لے۔ اس وجہ سے یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا نے زمین میں کس کا خلیفہ بنانے کا ارادہ ظاہر فرمایا تھا، اپنا یا زمین میں بسنے والی کسی پیشرو مخلوق کا؟ ایک رائے یہ ہے کہ انسان سے پہلے زمین میں جنات آباد تھے، جب انھوں نے اس میں فساد مچایا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو پراگندہ و منتشر کر دیا اور ان کی خلافت بنی نوع انسان کے سپرد فرمائی۔ دوسری رائے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین میں خود اپنا خلیفہ مقرر کرنے کا فیصلہ فرمایا۔ پہلی رائے اگرچہ بالکل بے بنیاد تو نہیں کہی جا سکتی لیکن قرآن یا تورات یا کسی قابلِ اعتماد حدیث میں کوئی ایسی چیز نہیں ملتی جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ انسان سے پہلے زمین میں جنات کی حکمرانی تھی، اس کی تائید میں اگر کوئی چیز پیش کی جا سکتی ہے تو اس کی حیثیت اشارہ و کنایہ سے زیادہ نہیں ہے اور محض کسی اشارہ و کنایہ پر ایک حقیقت کی بنیاد رکھ دینا ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے۔

دوسری رائے مختلف اعتبارات سے قوی معلوم ہوتی ہے۔ قرآن مجید نے انسان کی فضیلت کے بہت سے پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مثلاً یہ کہ اللہ تعالیٰ نے تمام چیزیں انسان کے لیے پیدا کی ہیں، فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ آدم کو سجدہ کریں، نیز اس کے بارے میں فرمایا کہ جو امانت آسمان اور زمین اٹھانے سے قاصر رہے اس کو انسان نے اٹھا لیا۔ یہ ساری باتیں اس امر کے حق میں ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنا خلیفہ بنایا ہو۔ لیکن ان تمام دلائل کے باوجود ایک سوال اس رائے سے متعلق بھی پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ خلیفہ تو اس کو مقرر کرنے کی ضرورت پیش آیا کرتی ہے جو غائب یا غیر حاضر ہوتا ہو، خدا تو نہ کبھی غائب

ہوتا ہے نہ غیر حاضر، آسمان و زمین ہر جگہ اس کی حکومت ہمیشہ رہی ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ پھر اس کے کسی کو خلیفہ مقرر کرنے کے کیا معنی؟

یہ سوال ہمارے نزدیک کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خلیفہ بنانے کا مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو زمین کے انتظام و انصرام کے معاملہ میں کچھ اختیارات دے کر یہ دیکھے گا کہ انسان ان اختیارات کو خدا کی مرضی کے مطابق استعمال کرتا ہے یا خلافت پا کر وہ مطلق العنان بن جاتا ہے اور اپنی من مانی کرنے لگ جاتا ہے۔ یہ گویا اصل حکمران کی طرف سے ایک نائب مقرر کیے جانے کی شکل ہوئی اور اس نائب کے تقرر کی ضرورت یہ نہیں تھی کہ اصل حکمران کو غائب یا غیر حاضر ہونا تھا بلکہ اس نائب کو کچھ اختیارات دے کر مقصود اس کی اطاعت و وفاداری کا امتحان کرنا تھا۔

'فساد فی الارض' کا مفہوم

قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ۔ قرآن مجید کی اصطلاح میں فساد فی الارض کا مفہوم یہ ہے کہ زمین کا نظم و نسق، اللہ تعالیٰ کے احکام و قوانین کے مطابق چلانے کے بجائے اس کو من مانے طریقہ پر چلایا جائے، خدا کی شریعت کی نافرمانی کی جائے اور اپنی خواہشوں کی پیروی کی جائے، زمین کے اصلی حکمران کی مرضی نظر انداز کی جائے اور خود اپنی مرضی چلائی جائے۔ یہ چیز بجائے خود فساد فی الارض اور بغاوت ہے، عام اس سے کہ یہ دھینگا مشتی اور سرکشی کے ساتھ واقع ہو یا کسی فکر و فلسفہ کے تحت پر امن طریقہ پر۔ اس زمین کا اصلی حکمران اللہ تعالیٰ ہے۔ انسان کی حیثیت اس کے اندر اصل حکمران کی نہیں بلکہ اصل حکمران کے نائب کی ہے۔ اس وجہ سے اس زمین کے امن و عدل کا انحصار اس چیز پر ہے کہ اس کے ہر گوشے میں خدا ہی کا قانون چلے۔ اگر اس کے کسی حصہ میں بھی خدا کا قانون باقی نہیں رہا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس حصے میں بغاوت پھوٹ پڑی ہے اور یہ چیز اس پوری زمین کے لیے ایک خطرہ ہے۔

خونریزی فساد فی الارض کا قدرتی نتیجہ ہے۔ جب خدا کا قانون عدل باقی نہیں رہے گا تو لازماً اس کی جگہ انسان کی اپنی خواہشات کی فرمانروائی ہوگی۔ اس چیز کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ کسی شخص کے بھی جان یا مال یا اس کی آبرو کے لیے کوئی ضمانت باقی نہیں رہے گی۔ کسی خاص خطۂ زمین کے مفسدین بالفرض کوئی ایسا نظام بنا بھی لیں جس میں باہم گر ایک دوسرے کے جان و مال کی حفاظت کی ضمانت دے دیں تو اس سے وہ اپنے لیے تو ایک تحفظ کی شکل پیدا کر لیں گے لیکن دوسروں کے لیے وہ بدستور خطرہ ہی بنے رہیں گے۔ ان کی مثال ڈاکوؤں کے ایک جتھے کی ہوگی جس کے افراد نے آپس میں تو یہ سمجھوتہ کر رکھا ہے کہ ایک دوسرے کے جان و مال پر دست درازی نہیں کریں گے لیکن ان کے جتھے سے باہر والوں کے جان و مال کو ان کی چیرہ دستیوں سے بچانے والی کوئی چیز بھی نہیں ہوگی۔ تمام عالمِ انسانی اور پورے کرۂ ارضی کے تحفظ کی ضمانت صرف خدا کا قانون ہی دے سکتا ہے جو سب کے جان و مال کی حفاظت کرتا ہے اور سب کو یکساں پابند کرتا اور یکساں آزادی بخشتا ہے۔

فرشتوں نے انسان کے بارے میں اس اندیشہ کا اظہار اس کے خلیفہ ہونے کی بنا پر کیا، اس لیے کہ خلیفہ کے لفظ کے اندر یہ چیز چھپی ہوئی ہے کہ اس کو ایک خاص حد کے اندر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اختیارات تفویض ہوں گے۔ فرشتوں نے محسوس کیا کہ اختیار کو استعمال کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے، اس کو پاکر انسان بہک سکتا ہے اور اس بہکنے کا نتیجہ زمین میں بدامنی اور فساد کی شکل میں ظاہر ہو سکتا ہے۔

'تسبیح' کی حقیقت

وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ: تسبیح کی اصل حقیقت، لغت کے اعتبار سے، کسی کے سامنے عجز و تذلل کے ساتھ بچھ جانا ہے۔ تسبیح قول سے بھی ہوتی ہے اور عمل سے بھی ہوتی ہے۔ عمل سے خدا کی تسبیح کا مفہوم خدا کے احکام کی تعمیل میں ہر وقت سر نگندہ رہنا ہے۔ یہ تسبیح اس کائنات کی وہ چیزیں بھی کرتی ہیں جو غیر ذی روح اور غیر ذی ارادہ ہیں۔ انسان کے جس عمل کو قرآن نے خاص طور پر تسبیح سے تعبیر کیا ہے وہ نماز ہے اس لیے کہ نماز سر نگندگی اور عجز و تذلل کی نہایت مکمل تصویر ہے۔ قولی تسبیح سے مراد خدا کی پاکی بیان کرنا ہے۔ یعنی خدا کو ان باتوں سے منزہ اور بالاتر قرار دینا جو اس کی شانِ الوہیت کے خلاف ہیں۔ اس اعتبار سے تسبیح میں منفی پہلو غالب ہے لیکن جب اس کے ساتھ حمد کی قید بڑھا دی جائے جیسی کہ یہاں ہے تو اس میں تنزیہہ کے ساتھ اثبات کا مفہوم بھی پیدا ہو جاتا ہے، یعنی خدا کو منافیٔ شانِ الوہیت صفات سے پاک قرار دینے کے ساتھ ساتھ ان صفات سے متصف بھی قرار دینا جن کی بنا پر وہ سزاوار حمد و شکر ہے۔

'نقدس لك' کا مفہوم

'نُقَدِّسُ لَكَ' کا مفہوم یہ ہے کہ ہم تیری پاکی، تیری برتری اور تیری قدوسیت بیان کرتے ہیں۔ تسبیح میں، تو جیسا کہ بیان ہوا، تنزیہہ کا مفہوم غالب ہے لیکن تقدیس کا مفہوم اللہ تعالیٰ کو پاکیزگی اور قدوسیت کی تمام صفات سے متصف قرار دینا ہے۔ تسبیح کے ساتھ تقدیس کی ضرورت اس وجہ سے ہے کہ جب تک انکار کے ساتھ یہ اقرار نہ ہو اس وقت تک اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کی تعریف کا حق نہیں ادا ہوتا۔

انسان کے متعلق مذکورہ بالا اندیشہ ظاہر کرنے کے بعد فرشتوں کی طرف سے اپنی اس تسبیح و تقدیس کا حوالہ دینا اس لیے نہیں تھا کہ انسان کے مقابل میں وہ خود اپنے حقدارِ خلافت ہونے کا اظہار کرنا چاہتے تھے۔ بلکہ اصل مقصود ان کا اللہ تعالیٰ کے اس فیصلہ کی حکمت و مصلحت معلوم کرنا تھا۔ اس غرض کے لیے انھوں نے ایک طرف تو اس اندیشہ کو ظاہر کر دیا جو انسان کی خلافت کے اندر ان کو مضمر نظر آیا دوسری طرف اس بات کو بھی ظاہر کر دیا کہ انسان کی تخلیق سے مقصود محض تسبیح و تقدیس تو ہو نہیں سکتا، اس لیے کہ یہ کام تو ہم کر ہی رہے ہیں۔

قَالَ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ: فرشتوں کے مذکورہ بالا سوال کے جواب میں ارشاد ہوا کہ اس اسکیم کے سارے پہلوؤں پر تمہاری نظر نہیں ہے۔ اس وجہ سے تمہارے ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہوا ہے۔ جب

پوری اسکیم تمھارے سامنے آجائے گی تو تم پر واضح ہو جائے گا کہ اس کے اندر اس اندیشہ کے سدِباب کا اہتمام بھی ہے جو تم نے ظاہر کیا ہے۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِىْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۳۱)

آدمؑ کو کن کے نام سکھائے گئے؟

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا: اللہ تعالیٰ نے آدم کو کن کے نام سکھائے؟ اس سوال کے جواب میں تین قول ہیں۔ ایک قول تو یہ ہے کہ اس سے مراد تمام چیزوں کے نام ہیں، دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد فرشتوں کے نام ہیں اور تیسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد آدمؑ کی ذریت کے نام ہیں۔

ان میں سے جہاں تک دوسرے قول کا تعلق ہے اس کی تائید میں قرآن میں کوئی دلیل نہیں ہے۔ اس وجہ سے اس پر کسی گفتگو کی ضرورت نہیں ہے۔ باقی رہا پہلا اور تیسرا قول تو ان میں سے تیسرا قول ہمارے نزدیک زیادہ قوی معلوم ہوتا ہے۔ اس کے وجوہ یہ ہیں:۔

اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اسماء پر الف لام عہد کا ہے۔ اگر اس کو عہد کا الف لام مانا جائے تو پھر اس سے کچھ خاص ناموں ہی کا مراد لینا صحیح ہوگا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کے لیے ضمیریں اور اشارے وغیرہ جو استعمال ہوئے ہیں وہ تمام تر وہ ہیں جو عربی زبان میں عام چیزوں کے لیے نہیں بلکہ خاص طور پر عقل و ادراک اور شعور و ارادہ رکھنے والی چیزوں کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً فرمایا ہے ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ (پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا) اَنْۢبِـُٔوْنِىْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ (مجھے ان لوگوں کے نام بتاؤ) يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ (اے آدم ان کو ان کے ناموں سے آگاہ کرو) فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ (تو جب ان کو ان کے ناموں سے آگاہ کیا)

تیسری وجہ یہ ہے کہ یہاں موقع فرشتوں کو قائل کرنے کا ہے۔ فرشتے حضرت آدمؑ کی ذریت کے متعلق یہ گمان رکھتے تھے کہ یہ خلافت پا کر زمین میں فساد مچائے گی اور خونریزیاں کرے گی۔ ان کے اس گمان کی تردید اگر ہو سکتی تھی تو اسی طرح ہو سکتی تھی کہ ان کو ذریتِ آدمؑ کا مشاہدہ کرایا جائے اور اولادِ آدمؑ میں جو انبیاء و رسل، جو مجددین و مصلحین اور جو شہداء و صدیقین پیدا ہونے والے تھے ان سے ان کو آگاہ کیا جائے تاکہ ان پر یہ بات واضح ہو سکے کہ اگر اولادِ آدمؑ کے اندر ایسے لوگوں کے پیدا ہونے کا امکان ہے جو اللہ تعالیٰ کے تفویض کردہ اختیارات کو بے جا طور پر استعمال کریں گے تو ساتھ ہی ان کے اندر ایسے لوگ بھی اٹھیں گے جو خود بھی اس ذمہ داری کا حق ادا کریں گے اور دوسروں کو بھی ان کی ذمہ داریوں سے آگاہ کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازیاں لگائیں گے۔

یہ تینوں باتیں بڑی اہمیت رکھنے والی ہیں۔ اگرچہ ان میں سے الگ الگ ہر ایک کے متعلق کوئی نہ کوئی کمزور قسم کا اعتراض اٹھایا جا سکتا ہے لیکن یہ تینوں مجموعی طور پر مل کر نہایت مضبوط دلیل اس بات کی بن جاتی

ہیں کہ اسماء سے مراد حضرت آدمؑ کی ذریت کے نام اور خاص کر ان لوگوں کے نام ہیں جو دنیا میں فساد کو مٹانے اور عدل کو قائم کرنے کے لیے آنے والے تھے۔

رہا یہ سوال کہ آدمؑ کی یہ ذریت تھی کہاں کہ ان کا مشاہدہ کرایا گیا اور ان کے نام بتائے گئے تو اس کا جواب خود قرآن مجید سے معلوم ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید میں تصریح موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام نسل آدمؑ کو ایک مرتبہ نکال کر ان سے اپنے رب ہونے کا اقرار لیا ہے۔

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ	اور یاد کرو جب کہ تیرے رب نے تمام بنی آدم یعنی
ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى	ان کی پیٹھوں سے ان کی ذریت کو نکالا اور ان کو خود
اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰى ۚ	ان کے اوپر گواہ بنایا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟
شَهِدْنَا ۚ (۱۷۲۔ اعراف)	انھوں نے اقرار کیا کہ ہاں ہم گواہ ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں بھیجنے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے عالم غیب میں ایک مرتبہ تمام نسل آدمؑ کے ایک اجتماع عام میں ان سے اپنی ربوبیت کا اقرار کرایا ہے۔ اسی اجتماع عام میں آدمؑ کو ان کی ذریت کے نام بھی بتائے گئے ہوں گے اور اسی موقع پر فرشتوں کے سامنے ان کو پیش کر کے وہ سوال و جواب بھی ہوا ہو گا جس کا یہاں حوالہ ہے۔

اَنْۢبِئُوْنِيْ بِاَسْمَاۗءِ هٰٓؤُلَاۗءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ: یعنی اگر تم اس گمان میں سچے ہو کہ اولادِ آدمؑ خلافت پا کر زمین میں فساد برپا کرے گی تو ان لوگوں کے نام بتاؤ کہ یہ کون لوگ ہیں، یہ زمین میں فساد برپا کرنے والے ہیں یا اس میں امن اور عدل قائم کرنے والے ہیں؟ اس میں فرشتوں کو قائل کرنے والا پہلو یہ ہے کہ نسل آدمؑ کے رویہ سے متعلق اگر کوئی رائے قائم کی جا سکتی ہے تو اسی شکل میں قائم کی جا سکتی ہے جب بہ حیثیت مجموعی ان کے بارے میں تمھیں واقفیت ہو لیکن جب اس طرح کی کوئی واقفیت تمھیں نہیں ہے تو پھر اس طرح کی بدگمانی کے لیے بھی کوئی وجہ نہیں ہے۔

قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ (۳۲)

'سُبْحٰنَكَ' کے مواقع استعمال

سُبْحٰنَكَ: قرآن مجید میں یہ کلمہ مختلف مواقع پر استعمال ہوا ہے۔

نامناسب اور خلافِ شان باتوں سے اللہ تعالیٰ کی تنزیہہ کے لیے مثلاً سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (۶۸۔ قصص) (اللہ پاک اور برتر ہے ان چیزوں سے جن کو یہ خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں)

دعا کے موقع کے لیے مثلاً دَعْوٰىھُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ (۱۰۔ یونس) (ان کی دعا اس میں یہ ہو گی کہ تو پاک ہے اے اللہ)

امر کے معنی کے لیے۔ مثلاً فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ (۱۷۔ روم) (پس اللہ کی تسبیح کرو جس وقت تم شام کرتے ہو اور جس وقت تم صبح کرتے ہو)

تعجب کے ساتھ کسی چیز کے انکار کے لیے۔ مثلاً سُبْحٰنَکَ ھٰذَا بُھْتَانٌ عَظِیْمٌ (۱۶۔ نور) (تو پاک ہے یہ ایک بہت بڑا بہتان ہے)

یہاں یہ کلمہ اپنے پہلے مفہوم کے لیے استعمال ہوا ہے۔ یعنی فرشتوں کا مطلب یہ تھا کہ تیری شان اس سے ارفع ہے کہ تیرے ہاتھوں کوئی ایسا کام ہو جو حکمت و مصلحت سے خالی ہو، ہم نے جس شبہ کا اظہار کیا ہے وہ محض ہمارے علم کی کمی کا نتیجہ ہے، ہمارے پاس تو صرف اتنا ہی علم ہے جتنا تو نے ہمیں بخشا ہے۔ علم اور حکمت کا اصلی خزانہ تو تیرے ہی پاس ہے۔

قَالَ یٰٓاٰدَمُ اَنْبِئْھُمْ بِاَسْمَآئِھِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَھُمْ بِاَسْمَآئِھِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّکُمْ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا کُنْتُمْ تَکْتُمُوْنَ (۳۳)

خدا کے سوا سارے غیب کا علم کسی کو نہیں

اَلَمْ اَقُلْ لَّکُمْ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ الآیۃ: یہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول کا حوالہ دیا ہے جو اوپر آیۃ ۳۰ میں گزر چکا ہے یعنی اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے) پہلے یہ بات اجمال کے ساتھ کہی گئی تھی لیکن جب فرشتوں کو اچھی طرح قائل کر دیا گیا اور وہ قائل ہو بھی گئے تو پھر اسی بات کو مزید وضاحت کے ساتھ فرمایا تاکہ یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے کہ اس کارخانۂ کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کی ساری حکمتیں اور مصلحتیں صرف اسی کو معلوم ہیں جس نے اس کارخانے کو بنایا ہے اور جو اس کو چلا رہا ہے۔ ان حکمتوں اور مصلحتوں کو فرشتے بھی، جو خدا سے اس قدر قرب رکھتے ہیں، نہ جانتے ہیں اور نہ خدا کے بتائے بغیر جان سکتے ہیں۔ اس وجہ سے قدرت کا کوئی فعل اگر بے حکمت و بے مصلحت نظر آئے تو اس کی بنا پر قدرت کو نشانۂ اعتراض یا خود اپنے آپ کو شکوک و شبہات کا مریض بنا لینے کے بجائے آدمی کو چاہیئے کہ اس چیز کو اپنے علم کی کمی پر محمول کرے اور فرشتوں کی طرح سُبْحٰنَکَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۭ اِنَّکَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ کا اقرار کرے، کیونکہ خدائے علیم و حکیم کا کوئی فعل بھی حکمت اور مصلحت سے خالی نہیں ہے لیکن اس کے سارے کاموں کی حکمتوں اور مصلحتوں کو سمجھنا نہ فرشتوں کے لیے ممکن ہے، نہ جنوں کے لیے اور نہ انسانوں کے لیے۔

اس کے ساتھ یہ جو فرمایا ہے کہ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا کُنْتُمْ تَکْتُمُوْنَ (اور میں جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپا رہے تھے) تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں تمہارے سوال کو بھی سمجھتا تھا اور اس اصل وجہ کو بھی جانتا تھا جس سے یہ سوال پیدا ہوا تھا۔ وہ وجہ یہ تھی کہ تم آدمؑ کی خلافت کی اسکیم کے مضمرات سے بے خبر تھے، تم چاہتے تھے کہ وہ تم پر ظاہر کیے جائیں، اس مقصد کے لیے تم نے اس اسکیم کے بُرے پہلوؤں کی طرف، جو واضح طور پر تمہیں نظر آئے، تم نے بہ شکل سوال اشارہ کیا تاکہ تم پر اس کے وہ پہلو کھولے جائیں جو خیر کے ہیں۔ چنانچہ آدمؑ کی ذریت کا مشاہدہ کرا کے اور ان کے ناموں سے تمہیں آگاہ کر کے تمہاری یہ خواہش پوری کر دی گئی۔ یہ بات اللہ تعالیٰ نے فرشتوں پر اپنے ایک احسان کے طور پر بیان فرمائی ہے کہ تمہارے سوال کے

ظاہر و باطن دونوں کا جواب تمھیں دے دیا گیا۔ اس میں فرشتوں کے لیے کسی غلامت کا کوئی پہلو نہیں ہے۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ٭ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ (۳۴)

سجدہ کا مفہوم

سجدۂ تعظیمی

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ: سجدہ کا لفظ عربی زبان میں جھکنے کے معنی میں آتا ہے۔ جھکنے کے مختلف مدارج ہو سکتے ہیں۔ کسی کے آگے تعظیم کے طور پر سر نہیوڑا دینا بھی جھکنا ہے اور پیشانی اور ناک کو زمین پر رکھ دینا بھی جھکنا ہے۔ پچھلے مذاہب میں تعظیم کی یہ قسم غیر اللہ کے لیے جائز تھی لیکن عموماً اس کی حد وہی تھی جو ہمارے ہاں رکوع کی ہے۔ بنی اسرائیل میں اس طرح کے تعظیمی سجدے کا عام رواج تھا اور تورات کے مختلف مقامات سے اس کی جو شکل معین ہوتی ہے وہ رکوع سے ملتی جلتی ہوتی ہے۔ اسلام نے تعظیم کی اس شکل کو خدائے رب العزت کے لیے خاص کر دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام خدا کا آخری اور کامل دین ہے، اس نے توحید کی حقیقت کو مکمل طور پر اجاگر کر دینے کے لیے خدا کے لیے تعظیم و تذلل کی شکلیں بھی خاص کر دی ہیں تاکہ اس کے اندر شرک کے داخل ہونے کے لیے کوئی رخنہ باقی نہ رہ جائے۔

فرشتوں کو آدم کے لیے سجدہ کرنے کا حکم دینے میں شرک کا کوئی پہلو نہیں ہے اس لیے کہ اولاً تو یہ سجدہ خدا کے حکم کی تعمیل میں تھا اس لیے گویا خدا ہی کو سجدہ تھا، ثانیاً سجدہ شرک کی علامت، جیسا کہ عرض کیا گیا، اسلام میں قرار دیا گیا ہے۔ اسلام سے پہلے اس کی اہمیت تعظیم کے ایک طریقہ سے زیادہ کچھ بھی نہیں تھی۔ اگر یہ کہا گیا کہ آدم کو سجدہ کرو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آدم کو تعظیم بجا لاؤ، اس سے زیادہ اس کا مفہوم نہیں ہے۔

سجدے کے حکم کی علت

فرشتوں کو آدم کی تعظیم بجا لانے کا حکم کیوں دیا گیا؟ ہمارے نزدیک یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتوں کی اطاعت اور بندگی کا ایک امتحان تھا۔ کسی کا امتحان اسی چیز میں لیا جاتا ہے جو اس کے نفس پر شاق ہو سکے۔ فرشتوں کی خلقت چونکہ نور سے ہوئی ہے اور وہ خدا کی تسبیح و تقدیس کے لیے پیدا ہوئے ہیں اس وجہ سے آدم خاکی کی تعظیم بجا لانے کے حکم میں ان کے لیے ایک بڑی آزمائش تھی لیکن فرشتے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اصلی عزت و سرفرازی نور یا نار سے پیدا ہونے میں نہیں ہے بلکہ پیدا کرنے والے کے احکام کی بے چون و چرا تعمیل میں ہے۔ چنانچہ وہ اس امتحان میں پورے اترے۔

اس میں شبہ نہیں کہ فرشتوں کے اس سجدے سے آدم کی بڑائی کا ایک پہلو بھی نمایاں ہوتا ہے لیکن یہاں مقصود آدم کی بڑائی کا اظہار نہیں بلکہ فرشتوں کی بندگی و اطاعت کا اظہار ہے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ جو خدا کے مطیع و فرمانبردار ہوتے ہیں وہ نسل و نسب کے غرور میں مبتلا ہو کر ابلیس کی طرح اکڑا نہیں کرتے بلکہ وہ اس طرح کی ہر چیز کو خدا کا فضل و احسان سمجھتے ہیں اور اس فضل و احسان کا احساس ان کے اندر غرور و تکبر کے بجائے تواضع اور بندگی پیدا کرتا ہے۔

بنی اسرائیل کے لیے ایک سبق

موقع کلام کے لحاظ سے یہ بات ان بنی اسرائیل کے لیے ایک سبق ہے جو نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملہ میں فرشتوں کی سی روش اختیار کرنے کے بجائے شیطان کی پیروی میں غرورِ نسل و نسب کے فتنے میں مبتلا ہو گئے تھے۔

آدمؑ کو سجدہ کرنے کے حکم کا مقصود

جو لوگ فرشتوں کی طرف سے آدم کی اس تعظیم کو آدم کی علمی فضیلت کا نتیجہ سمجھتے ہیں، میرے نزدیک ان کے اس خیال کے لیے کوئی مضبوط بنیاد نہیں ہے۔ اپنی ذریت کے اسماء کا علم جس طرح خدا کے بتانے سے آدمؑ کو حاصل ہو گیا اسی طرح آدم کے بتانے سے فرشتوں کو حاصل ہو گیا، پھر اس میں آدمؑ کی ایسی فضیلت کا کیا پہلو ہے جس کی بنا پر فرشتوں کو ان کے سجدہ کا حکم دیا جائے۔ علاوہ ازیں اس بات کا بھی کوئی قوی ثبوت موجود نہیں ہے کہ فرشتوں کو آدم کی اس تعظیم کا حکم اسی وقت دیا گیا جب آدمؑ نے ان کو ناموں سے آگاہ کیا ہے۔ بلاشبہ سجدہ کے حکم کا ذکر یہاں تعلیم اسماء کے ذکر کے بعد ہی آیا ہے۔ لیکن محض اتنی سی بات اس امر کے ثبوت کے لیے کافی نہیں ہے کہ پہلی چیز اسی دوسری چیز کا نتیجہ ہے۔ اول تو سجدے کے حکم کا بیان لفظ "اذ" سے شروع ہوتا ہے جو اس بات کے لیے ایک قوی قرینہ فراہم کرتا ہے کہ یہ ایک مستقل بات ہو، ضروری نہیں کہ یہ پہلی بات کے بعد ہی پیش آئی ہو۔ ثانیاً قرآن مجید کے دوسرے مواقع سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں کو آدم کے سجدے کا حکم نہ صرف آدم کی علمی فضیلت کے اظہار سے پہلے بلکہ ان کی پیدائش سے بھی پہلے دیا گیا تھا، مثلاً فرمایا ہے:۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۝ فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ ۝ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ۝ اِلَّاۤ اِبْلِیْسَ ؕ اَبٰۤی اَنْ یَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِیْنَ ۝ (حجر ۲۸-۳۱)	اور یاد کرو جب کہ تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں سڑے ہوئے گارے کی کھنکھناتی مٹی سے ایک بشر بنانے والا ہوں تو جب میں اس کو مکمل کر لوں اور اس میں اپنی روح میں سے روح پھونک لوں تو تم اس کے لیے سجدہ میں گر جانا تو سارے فرشتوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے۔ اس نے سجدہ کرنے والوں میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔

اس مضمون کی آیتیں قرآن مجید میں اور بھی ہیں جن سے واضح ہے کہ فرشتوں کو آدم کے سجدے کا حکم آدمؑ کی پیدائش سے پہلے دیا گیا تھا اور ان آیات سے ضمناً یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اصل مقصود اس سجدے سے فرشتوں کی اطاعت اور وفاداری کا امتحان ہی تھا چنانچہ یہی وجہ ہے کہ یہاں آدمؑ کے سڑے ہوئے گارے سے پیدا کیے جانے کی طرف خاص طور پر اشارہ کیا گیا ہے تاکہ اس امتحان میں فرشتوں کے لیے آزمائش کا جو پہلو ہے، وہ ان کے سامنے واضح ہو کر آجائے۔ ہم اوپر اس حقیقت کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ امتحان ہمیشہ اس چیز میں ہوا کرتا ہے جو نفس پر شاق ہو۔ فرشتوں کے لیے یہ بات بڑی ہی آزمائش کی تھی کہ وہ نور کی مخلوق ہوتے

کے باوجود آدمِ خاکی کو، جو سڑی ہوئی کیچڑ سے وجود میں آیا ہے سجدہ کریں لیکن وہ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھے کہ عزت و شرف بخشنے والی چیز درحقیقت خدا کی فرمانبرداری ہے نہ کہ نور یا نار سے پیدا ہونا، اس وجہ سے اس امتحان کے سخت ہونے کے باوجود وہ اس میں پورے اترے لیکن ابلیس اپنے غرور کے سبب سے اس امتحان میں ناکام ہوگیا۔

ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو کہ بعض آیات میں سجدے کا ذکر آدم کی پیدائش اور ان کی صورت گری کے بعد آیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض آیات میں ترتیب مضمون اس طرح بھی ہے لیکن اس طرح کے مواقع پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا مقصود انسان پر اپنی نعمتوں کا بیان ہے نہ کہ یہ واضح کرنا کہ فلاں واقعہ فلاں واقعہ کے بعد پیش آیا ہے۔

لفظ ابلیس کی تحقیق

اِلَّآ اِبْلِیْسَ: ابلیس، اَبْلَسَ سے افعیل کے وزن پر ہے۔ ابلس کے معنی غمگین ہونے، انکار کرنے اور مایوس ہونے کے ہیں۔ ابلیس دراصل اس جنّی کا لقب ہے جس نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا۔ قرآن مجید میں اس بات کی تصریح ہے کہ یہ جنات میں سے تھا۔ سورہ طٰہٰ میں ہے وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ (اور یاد کرو جب کہ ہم نے کہا فرشتوں سے کہ سجدہ کرو آدم کو تو انھوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے، وہ جنات میں سے تھا، اس نے اپنے رب کے حکم سے انحراف کیا)

قرآن مجید نے مکلّف مخلوقات کی حیثیت سے تین مخلوقات کا ذکر کیا ہے۔ فرشتے، جنات اور بنی آدم۔ شیطان کوئی مستقل مخلوق نہیں ہے۔ جنوں اور انسانوں میں سے جو لوگ خدا کی نافرمانی کی روش اختیار کر لیتے ہیں وہ لوگ ابلیس کی ذریت اور اس کے اولیاء میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کے جنات اور انسان گمراہی پر پیدا نہیں کیے گئے، پیدا تو یہ ہوئے ہیں اسی فطرت پر جس پر اللہ تعالیٰ نے تمام جنوں اور تمام انسانوں کو پیدا فرمایا ہے لیکن چوں کہ اللہ تعالیٰ نے جنوں اور انسانوں کو اختیار کی نعمت سے نوازا ہے اس وجہ سے ان میں سے جو لوگ اپنے لیے گمراہی کے راستے ہی کو پسند کر لیتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو اسی راستے پر چلنے کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس سنت کی قرآن مجید میں جگہ جگہ تفصیل فرمائی ہے۔ ہم اس کے مختلف پہلوؤں کی مناسب مواقع پر وضاحت کریں گے۔

ایک شبہ کا جواب

یہاں ایک بات بعض لوگوں کو کھٹکے گی۔ وہ یہ کہ سجدے کا حکم تو فرشتوں کو دیا گیا تھا نہ کہ جنات کو تو ابلیس کو جو جنات میں سے تھا سجدہ نہ کرنے پر لعنت کا مستحق کیوں قرار دیا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جنات اور فرشتوں میں اصل فرق خصائص اور صفات کے پہلو سے ہے، اپنی خلقت کے لحاظ سے جنات فرشتوں سے زیادہ دوری نہیں رکھتے، فرشتے نور سے پیدا ہوئے اور جنات نار سے۔ اس وجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ علی سبیل التغلیب جنات بھی اس حکم سجدہ میں شامل تھے، لیکن ان کے گمراہ فرد ابلیس نے

سجدہ سے انکار کیا، یہ رائے ہمارے بعض پچھلے مفسرین نے بھی ظاہر فرمائی ہے اور مجھے یہ رائے قوی معلوم ہوتی ہے[1]

وَقُلْنَا يَآدَمُ اسْكُنْ أَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظّٰلِمِينَ (۳۵)

الشجرۃ سے مراد

وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ: شجرہ پر الف لام داخل ہے جس سے یہ بات تو واضح ہے کہ جہاں تک آدمؑ اور حوا علیہما السلام کا تعلق ہے، ان کو یہ درخت تعین اور تخصیص کے ساتھ بتا دیا گیا تھا۔ رہا یہ سوال کہ یہ درخت کس چیز کا تھا؟ تو اس سوال کا جواب نہ تو قرآن مجید ہی نے دیا ہے اور نہ کسی صحیح حدیث ہی میں اس کا جواب موجود ہے اس وجہ سے اس کو معلوم کرنے کی کوشش ایک لاحاصل کوشش ہے۔ ہمارے نزدیک اس بارے میں صحیح مسلک امام ابن جریرؒ کا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم تعین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے کہ یہ درخت کس چیز کا تھا، کیونکہ اس کے تعین کے لئے کوئی دلیل نہ تو ہمیں قرآن ہی میں ملتی ہے نہ حدیث ہی میں، پھر آخر کوئی شخص کوئی بات کہے تو کس سند پر۔

ہمارے نزدیک اس درخت کو معلوم کرنے کی چنداں ضرورت بھی نہیں ہے۔ اصل چیز جو یہاں قرآن مجید بتانی چاہتا ہے وہ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح فرشتوں اور جنات کی وفاداری اور اطاعت کا امتحان آدمؑ کو سجدہ کرنے کا حکم دے کر لیا اسی طرح آدمؑ کی اطاعت و وفاداری کا امتحان ان کے لیے جنت کے درختوں میں سے ایک درخت کو حرام ٹھہرا کر لیا۔ نعمتوں سے بھری ہوئی اس جنت میں صرف ایک درخت ایسا تھا جس سے فائدہ اٹھانے سے حضرت آدمؑ کو روکا گیا تھا۔ لیکن انسان کی فطرت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ جس چیز سے وہ روک دیا جاتا ہے اسی کا وہ زیادہ حریص بن جایا کرتا ہے۔ چنانچہ ابلیس نے آدمؑ کی اسی کمزوری سے فائدہ اٹھایا اور ان کو یہ سمجھانا شروع کر دیا کہ زندگی جاوداں اور ملک لازوال کا راز اگر مضمر ہے تو بس اسی درخت کے پھلوں میں ہے جس سے ان کو محروم کر دیا گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آدمؑ شیطان کے اس چکمے میں آ گئے اور اس درخت کا پھل کھا بیٹھے۔ لیکن یہ غلطی کر گزرنے کے بعد شیطان کی طرح اپنی غلطی پر ضد نہیں کی بلکہ اس پر نادم

---

[1] قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ ملاحظہ ہوں:۔

او الجن ایضاً کانوا مامورین مع الملٰئکۃ لکنہ استغنی بذکر الملٰئکۃ عن ذکرھم فانہ اذا علم ان الاکابر مامورون بالتذلل لاحد والتوسل بہ علم ان الاصاغر ایضاً مامورون بہ والضمیر فی فسجدوا راجع الی القبیلتین (یا جن بھی فرشتوں کے ساتھ سجدہ کے حکم میں شامل تھے لیکن فرشتوں کے ذکر کے بعد جنات کے ذکر کی ضرورت اس وجہ سے باقی نہیں رہی کہ جب یہ بات معلوم ہو گئی کہ بڑوں کو کسی کی تعظیم و تکریم کا حکم ہوا ہے تو اس سے یہ بات آپ سے آپ واضح ہو گئی کہ چھوٹے بھی اس حکم میں شامل ہیں۔ اس صورت میں فسجدوا کی جو ضمیر ہے وہ دونوں گروہوں کی طرف لوٹے گی)

ہوئے اور توبہ کی۔

بالکل اسی طرح کی صورت حال اس دنیا میں ہمارے سامنے ہے۔ اس زمین کی ہر نعمت ہمارے لیے مباح ہے۔ صرف گنتی کی چند چیزیں ہیں جن سے خدا نے ہمیں روکا ہے لیکن ہم میں سے بہتوں کا حال یہ ہے کہ وہ شیطان کی وسوسہ اندازیوں کے سبب سے یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری اور دنیا کی ساری ترقی اور کامیابی کا راز بس انھی چند چیزوں کے اندر چھپا ہوا ہے جن سے خدا نے روک دیا ہے اور پھر ستم یہ ہے کہ نافرمانی کر کے اپنے باپ کی طرح نادم ہونے اور توبہ کرنے کے بجائے ابلیس کی طرح اکڑتے اور ضد کرتے ہیں۔

تورات میں اس درخت کو خیر و شر کی معرفت کا درخت کہا گیا ہے۔ یہ بات ہے تو دلچسپ لیکن ہمارے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے۔ غالباً اہل تورات نے یہ بات اول اول بطور ایک تاویل کے اس وجہ سے اختیار کی ہوگی کہ اس درخت کے پھل کھانے کا اثر یہ بیان کیا گیا ہے کہ آدم و حوا دونوں ننگے ہو کے رہ گئے۔ ابتداءً تو یہ بات ایک تاویل کی حیثیت سے سامنے آئی ہوگی لیکن بعد میں دل پسند ہونے کے سبب سے تحریف کے چور دروازے سے اس نے اصل متن کی جگہ حاصل کر لی ہوگی۔ قرآن مجید نے اس بات کا ذکر تو کیا ہے کہ اس درخت کے پھل کھانے کے بعد آدم ننگے ہو گئے لیکن قرآن سے یہ اشارہ نہیں نکلتا کہ یہ ننگے ہو جانا ان کے اندر دفعۃً عقل و شعور کے بیدار ہو جانے کا نتیجہ تھا بلکہ یہ واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے خدا کی نافرمانی کر کے اپنے اوپر جو ظلم کیا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ جنت کے لباس سے محروم ہو گئے۔

اگر آدم اس درخت کے پھل کھانے سے پہلے اتنے بے شعور تھے کہ ان کو اپنی ستر کا بھی کوئی احساس نہیں تھا تو اس وقت ان کا کسی امتحان میں ڈالا جانا اور وہ بھی ابلیس جیسے زیرک دشمن کے ہاتھوں ایک بالکل خلافِ عقل بات معلوم ہوتی ہے۔ اس امتحان سے پہلے ان کے اندر اتنی سوجھ بوجھ کا ہونا ناگزیر تھا کہ وہ شیطان کی وسوسہ اندازیوں کے مقابل میں اپنے خیر و شر کو سمجھ سکیں۔ اگر وہ اس سوجھ بوجھ سے عاری تھے تو ان کا شیطان کے فتنے میں پڑ جانا بالکل واضح تھا اور خدا کے انصاف سے یہ بات بالکل بعید ہے کہ وہ ان کو شیطان کے مقابل میں لا کھڑا کرتا اور پھر ان کی لغزش پر ان کی گرفت کرتا۔

فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطَٰنُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ ۖ وَقُلْنَا اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۖ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ (۳۶)

اِہْبِطُوْا کا خطاب کن سے ہے؟

اِهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ: اِہْبِطُوْا کا یہ خطاب حضرت ابن عباسؓ اور بعض دوسرے اہل تاویل کے نزدیک حضرت آدمؑ و حوا اور ابلیس سے ہے اور ابن زید کے نزدیک آدم و حوا اور ان کی ذریت سے۔ ہمارے نزدیک ان میں سے صحیح تاویل حضرت ابن عباسؓ کی ہے۔

اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہاں یہ جو فرمایا کہ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے تو یہ دشمنی اپنی فطری بنیاد اگر رکھتی ہے تو آدم اور ابلیس کے اندر ہی رکھتی ہے۔ آدم و حوا کے اندر نہیں رکھتی۔ آدم و حوا کے درمیان تو فطری

ربط الفت اور مودت کا ہے، اسی طرح اولادِ آدم کے اندر بھی فطری ربط و تعلق دراصل اخوت اور محبت کا ہے۔ ان کے اندر دشمنی اور عداوت کا بیج اگر پڑتا ہے تو شیطان کی کوششوں سے پڑتا ہے اور اسی کی فساد انگیزیوں سے یہ پرورش بھی پاتا ہے۔ انسان کی اپنی فطرت کے اندر اس تخم فساد کی پرورش کے لیے کچھ زیادہ صلاحیت نہیں ہے۔ شیطان اور آدم کی اس فطری عداوت کا ذکر قرآن مجید میں متعدد جگہ آیا بھی ہے۔

فَقُلْنَا يَا آدَمُ إِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ (۱۱۷ طٰہٰ)	ہم نے کہا اے آدمؑ یہ ابلیس تمہارا اور تمہاری بیوی کا دشمن ہے تو کہیں یہ تمہیں جنت سے نکلوا نہ چھوڑے۔
أَفَتَتَّخِذُونَهُ وَذُرِّيَّتَهُ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِي وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ (۵۰۔ کہف)	تو کیا تم ابلیس اور اس کی اولاد کو میرے بالمقابل اپنا دوست بناؤ گے حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں۔

اولادِ آدمؑ اور شیطان کے درمیان فطری تعلق کی نوعیت

اولادِ آدم میں سے اگر بہت سے لوگ ابلیس اور اس کی ذریت سے دوستی قائم کر لیتے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان کے درمیان فطری تعلق درحقیقت دوستی ہی کا ہے۔ فطری تعلق تو ان کے درمیان دشمنی کا ہے اور دشمنی ہی کا رہنا چاہیے، جیسا کہ اوپر کی کہف والی آیت سے اشارہ نکلتا ہے، لیکن بہت سے لوگ اپنی نادانی اور ناعاقبت اندیشی کے سبب سے اپنے دشمنوں ہی کو اپنا دوست سمجھ بیٹھتے ہیں اور ان کے آلۂ کار بن کر خود اپنے آپ کو تباہ کر لیتے ہیں۔

اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں دوسرے مقامات میں اس بات کی تصریح ہے کہ جس طرح آدمؑ کو جنت سے نکلنے کا حکم دیا گیا تھا اسی طرح ابلیس کو بھی بعینہٖ انہی الفاظ میں یہ حکم دیا گیا تھا۔ سورۂ اعراف میں ہے۔ قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُونُ لَكَ أَنْ تَتَكَبَّرَ فِيهَا فَاخْرُجْ إِنَّكَ مِنَ الصَّاغِرِينَ (خدا نے کہا تو یہاں سے اتر، تجھے کوئی حق نہیں ہے کہ تو یہاں گھمنڈ کرے، سو تو نکل، تو ذلیل ہونے والوں میں سے ہوگا)

تیسری وجہ یہ ہے کہ بعض جگہ اس حکم کے ساتھ جمیعًا کا لفظ بطور تاکید آگیا ہے۔ مثلاً سورہ طٰہٰ میں ہے اهبطا منها جمیعا، خود اس سورہ میں بھی آگے چل کر ہے قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا۔ اگر یہ خطاب صرف آدمؑ حوّا سے مانا جائے تو پھر جمیعًا کا لفظ کچھ غیر ضروری سا ہو کے رہ جاتا ہے۔ اور اگر اس کو مفید بنانے کے لیے یہ فرض کیا جائے کہ آدم و حوّا کے ساتھ یہ حکم ان کی اولاد کے لیے بھی تھا تو یہ ایک تکلف سا ہوگا، کیونکہ ذریت آدمؑ کے متعلق اس مرحلے تک اگر کوئی بات سامنے آئی ہے تو صرف اس حد تک آئی ہے کہ ان سے خدا کی ربوبیت کا اقرار لیا گیا اور آدم اور فرشتوں کو ان کا مشاہدہ کرایا گیا۔ یہ ماننے کے لیے قرآن میں مشکل ہی سے کوئی دلیل مل سکے گی کہ آدم کی ذریت آدم کے ساتھ جنت میں تھی بھی اور وہ اپنے باپ کے گناہ میں جنت سے نکالی بھی گئی۔

رہی یہ بات کہ بعض جگہ قرآن مجید میں مثنّٰی کا صیغہ استعمال ہوا ہے اور یہ ایک واضح دلیل ہے اس بات کی کہ خطاب حضرت آدمؑ اور حوّا ہی سے ہے تو ہمارے نزدیک یہ دلیل بھی کچھ زیادہ وزنی نہیں ہے۔ بلا شبہ بعض جگہ مثنّٰی

کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ مثلاً اِهْبِطَا مِنْهَا جَمِيعًا ۚ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۖ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقَىٰ (۱۲۳۔ طٰہ) (اس سے اترو سب، تم ایک دوسرے کے دشمن ہوگے۔ پس اگر آئے تمھارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت تو جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے وہ نہ تو گمراہ ہوں گے اور نہ محروم)

لیکن یہ تثنیہ کا صیغہ حضرت آدمؑ اور حواؑ کے لیے استعمال نہیں ہوا ہے بلکہ سیاق و سباق دلیل ہے کہ یہ آدم اور ابلیس دونوں کو بحیثیت دو فریقوں اور دو پارٹیوں کے خطاب کر رہا ہے۔ اور یہاں ہدایت کی پیروی کے بارے میں جو حکم ہے وہ جس طرح بنی نوع انسان کے لیے موزوں ہے اسی طرح بنی نوع جن کے لیے بھی موزوں ہے۔

فَتَلَقَّىٰ آدَمُ مِنْ رَبِّهِ كَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ (۳۷)

فَتَلَقَّىٰ آدَمُ مِنْ رَبِّهِ كَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ: توبہ کے معنی رجوع کرنے کے ہیں۔ جب اس کا صلہ علیٰ کے ساتھ آتا ہے تو یہ اس بات کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ اس کے اندر رحم کا مضمون چھپا ہوا ہے۔

"تَلَقّٰى" کے لفظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ توبہ کے یہ الفاظ حضرت آدم علیہ السلام کے اوپر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئے۔ دوسری جگہ قرآن مجید میں ان الفاظ کا حوالہ بھی ہے۔ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا وَإِنْ لَمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ (۲۳۔ اعراف) (اور ان دونوں نے دعا کی کہ اے رب ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو ہمیں نہ بخشے گا اور ہم پر رحم نہ فرمائے گا تو ہم برباد ہونے والوں میں سے بن جائیں گے)

توبہ کے بارے میں سنت اللہ

توبہ کے لیے حضرت آدم علیہ السلام کا بے قرار ہونا اور توبہ کے الفاظ کا ان کے دل میں ڈالا جانا اللہ تعالیٰ کی اس سنت کا پتہ دیتا ہے جو توبہ سے متعلق اس نے پسند فرمائی ہے۔ وہ سنت یہ ہے کہ بندہ جب کوئی گناہ کر گزرتا ہے تو ندامت و شرمندگی اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کا ایک احساس اس کے اندر خود بخود ابھرتا ہے۔ یہ احساس اس کی فطرت کا ایک تقاضا ہے اور یہ اس وقت تک برابر ابھرتا رہتا ہے جب تک انسان غلطیوں اور گناہوں پر اصرار کر کرکے اپنے اس احساس کو بالکل کچل کے نہ رکھ دے۔ اسی خاص کام کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر نفس لوامہ کو ودیعت فرمایا ہے۔ اس سے متعلق دوسری تفصیلات مناسب مواقع پر آئیں گی۔

قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا ۖ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۳۸)

قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا: یہ الفاظ دو مرتبہ دہرائے گئے ہیں، ایک مرتبہ حضرت آدمؑ کی لغزش کے بعد، پھر دوبارہ ان کی توبہ کے بعد۔ لغزش کے بعد اس کا ذکر اس لغزش کا نتیجہ بیان کرنے کے لیے ہوا ہے اور توبہ کے بعد اس امتحان کی حکمت بیان کرنے کے لیے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اب تمھیں دنیا میں بھیج کر تمھارا امتحان کرنا چاہتا ہے تاکہ تمھارے برے اور بھلے میں امتیاز ہو سکے تو جو اس امتحان میں پورے اتریں گے وہ اس جنت کے وارث ہوں گے اور جو اس امتحان میں فیل ہو جائیں گے وہ اس جنت

سے محروم رہیں گے۔

نبوت کے اجرا کا پہلا وعدہ

فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًى: یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت آدمؑ اور ان کی ذریت کے لیے نبوت و رسالت کا سلسلہ جاری کرنے کا پہلا وعدہ ہے۔ حضرت آدمؑ کی لغزش سے انسانی فطرت اور انسانی عقل کا وہ ضعف ظاہر ہوگیا جو انسان کو وحی الٰہی کی رہنمائی اور انبیا علیہم السلام کی دستگیری کا محتاج ثابت کرتا ہے چنانچہ انسان کی اس کمزوری پر نگاہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے بطور تسکین و تسلی یہ وعدہ فرمایا کہ وہ خود اپنی طرف سے انسان کی رہنمائی کے لیے روشنی بھیجے گا تو جو لوگ اس روشنی کی قدر کریں گے ان کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ کوئی غم۔

"نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ کوئی غم" کے الفاظ قرآن مجید میں جنت کی تعبیر کے لیے خاص ہیں۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ جنت کی تعبیر کے لیے یہ الفاظ بہت جامع ہیں۔ خوف کسی پیش آنے والے خطرے کا ہوا کرتا ہے اور حزن ماضی یا حاضر کے کسی خسارہ کا۔ ایسی جگہ جہاں نہ ماضی کا کوئی غم ہو نہ مستقبل کا کوئی خطرہ، جنت ہی ہو سکتی ہے۔

وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ (۳۹)

وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَآ: یہ آیت اوپر والی آیت کے بالمقابل ہے۔ اوپر والی آیت میں ان لوگوں کا صلہ بیان ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی ہدایت کی پیروی کریں گے۔ اس آیت میں ان لوگوں کا انجام بیان ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ کی آیات کی تکذیب کریں گے۔

لفظ 'آیت' کے مختلف مفہوم

آیات کا لفظ آیت کی جمع ہے۔ آیت کے اصل معنی علامت اور نشانی کے ہیں۔

قرآن مجید میں یہ لفظ ان دلائل اور نشانیوں کے لیے بھی استعمال ہوا ہے جو آسمان و زمین اور آفاق و انفس کے ہر گوشے میں موجود ہیں اور جو خدا کی قدرت و حکمت، اس کی توحید اور اس کے قانون جزا و سزا کی گواہی دے رہی ہیں۔

ان معجزات کے لیے بھی استعمال ہوا ہے جو حضرات انبیا علیہم السلام کے ذریعے سے ظاہر ہوئے ہیں یا جن کے لیے کفار مطالبہ کرتے رہے ہیں۔

قرآن مجید کی ان آیتوں کے لیے بھی استعمال ہوا ہے جن سے قرآن کی سورتیں مرکب ہیں۔ قرآن مجید کی آیات کے لیے اس لفظ کا استعمال اس حقیقت پر دلیل ہے کہ ان کی حیثیت بے دلیل احکامات کی نہیں ہے بلکہ ان میں سے ہر آیت ایک دلیل و شہادت اور ایک حجت و برہان کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔

۲۵۔ مجموعۂ آیات ۳۰-۳۹ کی تعلیمات

یہ مجموعۂ آیات جن حقائق پر مشتمل ہے ان میں سے بہت سی باتوں کی طرف ہم الفاظ اور جملوں کی تشریح

کرتے ہوئے اشارے کر چکے ہیں، یہ اشارے ہمارے نزدیک رہنمائی کے لیے کافی ہیں لیکن اس کے اندر بعض ایسے حقائق بھی ہیں جن سے وہ سوالات حل ہوتے ہیں جن پر اسلامی فکر و فلسفہ اور اسلامی نظام کی بنیادیں استوار ہوئی ہیں، مثلاً یہ کہ اس دنیا میں انسان کا اصلی مرتبہ و مقام کیا ہے؟ انسان اس دنیا میں خود مختار و مطلق العنان ہے یا پابند و محکوم؟ مسئول ہے یا غیر مسئول؟ مجبور ہے یا با اختیار؟ اس کو کسی نے اس دنیا میں بھیجا ہے یا وہ خود بخود اس میں در آیا ہے؟ اس کا وجود محض ایک انفرادی وجود ہے یا وہ اپنی کوئی اجتماعی ہستی بھی رکھتا ہے؟ اس کی رہنمائی کے لیے اس کی اپنی ہی عقل و فہم کافی ہے یا اس کے علاوہ وہ کسی اور ما فوق رہنمائی کا بھی محتاج ہے؟ اس کائنات کے دوسرے عناصر کے ساتھ اس کے ربط کی نوعیت کیا ہے؟ یہ اپنی فطرت کے لحاظ سے بدی کی مخلوق ہے یا نیکی کی؟ اس کے اندر جو بدی پائی جاتی ہے اس کا سر چشمہ کیا ہے؟ غرض اس طرح کے بہت سے بنیادی سوالات ہیں جن کے جواب ان آیات کے اندر موجود ہیں۔ اب ہم ایک مناسب ترتیب کے ساتھ ان کو واضح کرنا چاہتے ہیں۔

خلافت اور اس کے مقتضیات

ان آیات سے پہلی حقیقت تو یہ واضح ہوتی ہے کہ انسان کی حیثیت اس دنیا میں خدا کے خلیفہ اور نائب کی ہے۔ یہ بات قرآن مجید کے الفاظ میں نہایت واضح طور پر کہی گئی ہے۔ اس خلافت و نیابت کی حقیقت پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس کے کچھ لازمی تقاضے ہیں جن کے پورے ہوئے بغیر خلافت کا تصور مکمل نہیں ہو سکتا۔ ہمارے نزدیک یہ تقاضے بالاجمال یہ ہیں۔

ایک یہ کہ انسان کو ایک خاص دائرے کے اندر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اختیار تفویض ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو ذات خود ہر جگہ حاضر و ناظر ہو، جو ہر قسم کے تصرف پر خود پوری پوری قدرت رکھتی ہو، جو کسی کی مدد اور کسی کی اعانت کی محتاج نہ ہو، جس کو ایک پل کے لیے بھی اپنی مملکت کے امور و معاملات سے دستکش یا غیر حاضر ہونے کی ضرورت پیش نہ آتی ہو، اس کی طرف سے کسی کو اپنا خلیفہ یا نائب بنانے کے معنی اس کے سوا کچھ ہو ہی نہیں سکتے کہ وہ اپنے خلیفہ کو کچھ اختیارات دے کر یہ امتحان کرنا چاہتی ہے کہ یہ ان اختیارات کو کس طرح استعمال کرتا ہے، ان کو اپنے مستخلِف کی مرضی کے مطابق استعمال کرتا ہے یا اس کی مرضی سے بے پروا ہو کر اپنی من مانی کرنے لگ جاتا ہے۔

دوسرا یہ کہ جب انسان خلیفہ اور نائب ہے تو یہ عین اس کی خلافت اور نیابت کا اقتضا ہے کہ مستخلف کی طرف سے اس کی آزادی کے حدود معین و معلوم ہوں، اس کو واضح طور پر یہ بتا دیا گیا ہو کہ کن امور میں اس کو مستخلف کے مقرر کردہ حدود کی پابندی کرنی ہے اور کن امور میں اس کو اپنی صوابدید پر عمل کرنے کی آزادی بخشی گئی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کی تعبیر اگر کی جائے تو یوں بھی کی جا سکتی ہے کہ عین خلافت و نیابت کی فطرت کا اقتضا ہے کہ انسان کی ہدایت و رہنمائی کے لیے خدا کی طرف سے شریعت و ہدایت نازل ہو۔

تیسرا یہ کہ جب انسان خدا کا خلیفہ اور نائب ہے تو اس کے مطلق العنان اور غیر مسئول ہونے کا تصور

بنیادی طور پر غلط ہے۔ کوئی صاحب قدرت اور علیم و خبیر مستخلف اپنے خلیفہ کو شتر بے مہار بنا کر نہیں چھوڑ سکتا۔ وہ لازماً اپنے خلیفہ کی ایک ایک بد دیانتی اور ایک ایک خیانت پر اس سے مواخذہ بھی کرے گا اور اگر اس نے اپنے فرائض صحیح طور پر انجام دیے ہوں گے تو اس کو اس کی خدمات کا بھرپور صلہ بھی دے گا۔

چوتھا یہ کہ عین منصب خلافت کی فطرت کا تقاضا ہے کہ یہ منصب صفات کے ساتھ مشروط ہو۔ غیر مشروط نہ ہو یعنی منشائے خلقت کے لحاظ سے تو یہ منصب تمام بنی نوع انسان کے لیے عام ہے۔ ہر انسان خدا کا خلیفہ ہے، لیکن یہ اس منصب کی فطرت کا تقاضا ہے کہ اس کے جائز حقدار وہی ہوں جو خدا کی خلافت کے حق کو وفاداری کے ساتھ ادا کریں، جو اس حق کو ادا نہ کریں وہ خدا کے خلیفہ نہیں بلکہ اس کے باغی اور غدار ہیں۔

پانچواں یہ کہ یہ منصب اپنے مزاج کے لحاظ سے صرف ایک انفرادی منصب نہیں ہے بلکہ ایک اجتماعی اور سیاسی منصب بھی ہے۔ تمام انسانوں کو یا کم از کم ان سارے لوگوں کو جو اس منصب کی ذمہ داریوں پر ایمان رکھتے ہیں، انفرادی طور پر بھی اس منصب کے فرائض پورے کرنے ہیں اور اجتماعی طور پر بھی اس کے مقاصد کو بروئے کار لانے کے لیے ایک نظام قائم کرنا ہے کیونکہ اس نظام کے بغیر اس کے مقاصد پورے نہیں ہو سکتے۔

چھٹا یہ کہ یہ خلافت خیر و فلاح کی ضامن اس وقت تک رہ سکتی ہے جب تک یہ اصل مستخلف کے احکام و ہدایات کے مطابق چلائی جائے۔ اگر اس کے احکام کو پس پشت ڈال کر انسان اس کو اپنی خواہشات کے مطابق چلانے کی کوشش کرے گا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ اس زمین میں خونریزی اور فساد برپا ہو۔

انسان کی برتری

دوسری حقیقت یہ واضح ہوتی ہے کہ انسان کو جب اللہ تعالیٰ نے یہ درجہ دیا ہے کہ فرشتوں نے اس کو سجدہ کیا اور ابلیس اس کو سجدہ نہ کرنے ہی کے سبب سے ملعون ہوا تو یہ بات کسی طرح اس کے شایان شان نہیں ہے کہ وہ جنات یا فرشتوں میں سے کسی کو خدا کا شریک سمجھ کر ان کی پرستش کرے۔ جہاں تک خدا کا تعلق ہے اس کے آگے جس طرح انسان عاجز و بےبس ہے اسی طرح فرشتے اور جنات بھی عاجز و بےبس ہیں۔ ان کے پاس جو علم ہے وہ بھی خود ان کا اپنا ذاتی نہیں بلکہ تمام تر اللہ تعالیٰ ہی کا عطا کردہ ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو انسان علم میں فرشتوں سے بھی بازی لے جا سکتا ہے اس وجہ سے بندگی اور پرستش کا حقیقی حقدار صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ انسان اگر اس حق میں جنوں اور فرشتوں کو بھی شریک کرتا ہے تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کی توہین نہیں کرتا بلکہ خود اپنی بھی توہین کرتا ہے۔

گناہ کا سرچشمہ

تیسری حقیقت ان آیات سے یہ واضح ہوتی ہے کہ انسان اپنی فطرت کے لحاظ سے کوئی مجرم اور فسادی وجود نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو نہایت اچھی صلاحیتوں اور نہایت اعلیٰ قابلیتوں کے ساتھ پیدا کیا۔ یہ اگر گناہ میں مبتلا ہوتا ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ یہ کوئی ازلی و ابدی گنہگار ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اختیار کی اس نعمت کو جس سے اللہ تعالیٰ نے اس کو مشرف فرمایا ہے، غلط استعمال کرنے کے فتنہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس فتنہ میں اس کو شیطان مبتلا کرتا ہے اور اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ

نے انسان کی وسیع آزادی پر جو چند پابندیاں عائد کر دی ہیں، شیطان انسان کو ورغلاتا ہے کہ بس یہی پابندیاں ہیں جو اس کے سارے عیش و آرام کو کرکرا کیے ہوئے ہیں، اگر وہ ان کو جرأت کر کے توڑ ڈالے تو بس اس کے لیے ترقی و کمال اور عیش و آرام کے تمام دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ شیطان کے ان مشوروں کا فائدہ چوں کہ انسان کو نقد نقد نظر آتا ہے اس وجہ سے وہ اس کے چکمے میں آجاتا ہے اور اپنی فطرت کے اعلیٰ تقاضوں کے خلاف گناہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

اس گناہ سے اس کو پاک کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے توبہ اور اصلاح کی راہ کھولی ہے۔ چناں چہ حضرت آدمؑ سے جو لغزش صادر ہوئی اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ کے بعد وہ معاف کر دی۔ اس کے بعد ان کو اس دنیا میں جو بھیجا تو اس کی وجہ حضرت آدمؑ کا معتوب ہونا نہیں ہے بلکہ محض ان کا امتحان ہے تاکہ وہ شیطان کے مقابل میں اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کا ثبوت دیں اور اس کے صلہ میں اس جنت کو پھر حاصل کریں جس سے وہ نکالے گئے۔

قرآن کے اس بیان سے عیسائیوں کے اس خیال کی پوری پوری تردید ہو جاتی ہے جو آدم کے ازلی و ابدی گنہگار ہونے سے متعلق ان کے ہاں پایا جاتا ہے اور جس کے حل کے لیے انھوں نے کفارہ کا عقیدہ گھڑا ہے۔

خدا کے ہر کام میں حکمت ہے

چوتھی حقیقت یہ واضح ہوتی ہے کہ خدا کی ہر بات کے اندر نہایت گہری حکمتیں اور مصلحتیں پوشیدہ ہوتی ہیں لیکن ان تمام حکمتوں اور مصلحتوں سے جب تک اللہ تعالیٰ ہی واقف نہ کرے نہ ان سے جنات واقف ہو سکتے ہیں نہ فرشتے اور نہ انسان۔ اللہ تعالیٰ کے کاموں کے بارے میں صحیح روش انسان کے لیے یہ ہے کہ ان کی حکمتیں معلوم کرنے کی کوشش تو برابر کرتا رہے لیکن اگر کسی چیز کی حکمت اس کی سمجھ میں نہ آئے تو اس کو ہدف اعتراض و مخالفت نہ بنالے بلکہ یہ حسن ظن رکھے کہ اس کے اندر ضرور کوئی نہ کوئی حکمت ہوگی لیکن اپنے علم کی کمی کے سبب سے وہ اس حکمت کو سمجھ نہیں سکا ہے۔ یہی روش اختیار کر کے انسان ایمان و اسلام کے جادہ پر استوار رہ سکتا ہے اور یہی روش فرشتوں کی روش ہے۔ رہے وہ لوگ جو اپنے نہایت قلیل اور محدود علم کو خدا کے علم اور اس کی حکمتوں کے ناپنے کا پیمانہ بنا بیٹھتے ہیں تو وہ اسی قسم کی خودسری اور انانیت میں مبتلا ہو جاتے ہیں جس قسم کی خودسری اور انانیت میں ابلیس مبتلا ہو گیا۔ اس طرح کے لوگوں کے لیے ایمان و معرفت کے راستے کھلتے نہیں بلکہ جو راستے کھلے ہوئے ہوتے ہیں وہ بھی بند ہو جایا کرتے ہیں۔

آدمؑ اور ابلیس کے گناہ میں فرق

پانچویں حقیقت یہ واضح ہوتی ہے کہ جو گناہ انسان کے محض ارادہ کی کمزوری سے صادر ہوتا ہے اس کا مزاج اس گناہ سے بالکل مختلف ہوتا ہے جس کا سرچشمہ حسد اور تکبر ہوتا ہے۔ ضعف ارادہ سے صادر ہو جانے والے گناہ کے بعد توبہ اور اصلاح حال کی توقع بہت غالب ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو، اگر وہ بالکل ہی اپنے آپ کو چھوڑ نہیں بیٹھتے ہیں، سنبھالتا ہے اور ان کی رہنمائی صراط مستقیم کی طرف کرتا ہے۔ برعکس اس کے جو لوگ حسد اور تکبر کی بنا پر خدا کی نافرمانی کرتے ہیں ان کی بیماری بہت ہی سخت ہوتی ہے۔ ایسے لوگ

اصلاح پذیر ہونے کے بجائے بالعموم اپنے مرشد — ابلیس — ہی کی راہ پر جیتے اور اسی پر مرتے ہیں۔ حضرت آدمؑ کا گناہ پہلی قسم کا تھا اس وجہ سے ان کو توبہ کی توفیق حاصل ہوئی اور ابلیس کا گناہ دوسری قسم کا، اس وجہ سے وہ توبہ اور اصلاح سے محروم رہا اور اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہوئی۔

نبوت و رسالت کی ضرورت

چھٹی حقیقت یہ واضح ہوتی ہے کہ چوں کہ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو انسان کے بہکانے کی مہلت دے کر انسان کو اس دنیا میں ایک سخت امتحان میں ڈالا ہے اس وجہ سے اس کی رحمت متقضی ہوئی کہ وہ انسان کی ہدایت اور اصلاح کے معاملہ کو تنہا اس کی عقل و فطرت ہی پر نہ چھوڑے بلکہ اس کی فطرت کو بیدار رکھنے اور اس کی عقل کو کجرویوں اور گمراہیوں سے بچانے کا بھی سامان کرے تاکہ جو ہدایت کی راہ اختیار کرنا چاہیں وہ بھی علیٰ وجہ البصیرۃ اختیار کریں اور جو گمراہی کی راہ پر جانا چاہیں وہ بھی پوری طرح اتمام حجت کے بعد جائیں۔ نبوت و رسالت کے قیام سے اصل مقصود یہی چیز ہے اور اس امتحان گاہ عالم میں انسان کے لیے اصلی سرمایہ تسکین و تسلی درحقیقت یہی انبیا علیہم السلام کی تعلیمات ہیں۔ اگر یہ چیز انسان سے چھن جائے تو پھر انسان ہر فتنہ کا بڑی آسانی سے شکار ہو سکتا ہے کیوں کہ اس کی فطرت کے اندر جو خلا ہیں وہ صرف انبیا علیہم السلام کی تعلیم کی پیروی سے ہی بھر سکتے ہیں۔ اس کے بغیر انسان کے لیے شیطان کے فتنوں سے مامون ہونا ممکن نہیں ہے۔

۲۶۔ آگے کا مضمون ___ آیات ۴۰-۴۶

شروع سورہ سے لے کر یہاں تک کا پورا سلسلۂ کلام ایک تمہید یا مقدمہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس تمہید میں خطاب اگرچہ بیشتر نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے ہے، اس میں کہیں براہ راست یہود کو مخاطب کر کے کوئی بات ان سے نہیں کہی گئی ہے لیکن اشارات و کنایات کے پردے میں جو کچھ کہا گیا ہے، ہماری پیش کردہ تفصیلات سے واضح ہے کہ ہے وہ تمام تر یہود ہی سے متعلق۔ اب یہ تمہید ختم ہو گئی۔ آگے یہود کو براہ راست مخاطب کر کے پہلے ان کو ان کی ذمہ داریاں یاد دلائی گئی ہیں جو از روئے تورات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور آپ کی دعوت سے متعلق ان پر عائد ہوتی ہیں، پھر تفصیل کے ساتھ ان کے وہ جرائم بیان ہوئے ہیں جن کے سبب سے وہ اس بات کے مستحق ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو منصب امامت سے معزول کر کے دوسروں کو اپنی ہدایت و شریعت سونپے۔ یہ مضمون تقریباً اس سورہ کے آدھے حصّہ پر حاوی ہے اور اس میں دعوت و ملامت کے بعد ان کی معزولی کے وجوہ کی پوری تفصیل نہایت خوبی اور نہایت جامعیت کے ساتھ پیش کر دی گئی ہے۔ اب ہم اس کے ایک ایک ٹکڑے کو لے کر اس کی تفصیل کریں گے۔ فرمایا:

آیات ۴۰-۴۶

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ۝۴۰ وَاٰمِنُوْا بِمَآ

اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهٖ ۠
وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ﴿۴۱﴾ وَلَا تَلْبِسُوا
الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۲﴾ وَاَقِيْمُوا
الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾ اَتَاْمُرُوْنَ
النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ۭ
اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ وَاِنَّهَا
لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ﴿۴۵﴾ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا
رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۴۶﴾ ع

ع ۵ ۱

ترجمہ آیات ۴۰-۴۶

اے بنی اسرائیل یاد کرو میری اس نعمت کو جو میں نے تم پر کی اور میرے عہد کو پورا کرو، میں
تمہارے عہد کو پورا کروں گا، اور مجھی سے ڈرو۔ اور ایمان لاؤ اس چیز پر جو میں نے اتاری ہے
تصدیق کرتی ہوئی اس چیز کی جو تمہارے پاس ہے اور تم اس کے سب سے پہلے انکار کرنے
والے نہ بنو اور میری آیات کو حقیر پونجی کے عوض نہ بیچو اور میرے غضب سے بچتے ہی رہو۔ اور
حق اور باطل کو گڈمڈ نہ کرو حق کو چھپانے کے لیے درآں حالے کہ تم جانتے ہو، اور نماز قائم کرو
اور زکوٰۃ دو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔ کیا تم لوگوں کو وفاداری کا حکم دیتے ہو
اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو اور حال یہ ہے کہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو؟ کیا تم سمجھتے
نہیں؟ اور مدد چاہو صبر اور نماز سے اور بے شک یہ بھاری چیز ہے مگر ان لوگوں کے لیے
جو ڈرنے والے ہیں، جو گمان رکھتے ہیں کہ انھیں اپنے رب سے ملنا ہے اور وہ اسی کی طرف
لوٹنے والے ہیں۔ ۴۰-۴۶

۲۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ وَ اَوۡفُوۡا بِعَہۡدِیۡۤ اُوۡفِ بِعَہۡدِکُمۡ وَ اِیَّایَ فَارۡہَبُوۡنِ (۴۰)

لفظ 'اسرائیل' کی تحقیق

یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ : اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب ہے، یہودی علما اس کے معنی بطل اللہ کے بتاتے ہیں۔ یہ معنی لینے میں غالباً اس روایت کو بڑا دخل ہو گا جو یہود نے تورات میں حضرت یعقوبؑ کے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کشتی لڑنے کی داخل کر رکھی ہے۔

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ عبرانی زبان سے بھی واقف تھے۔ ان کی تحقیق میں یہ لفظ دو جزوں سے مرکب ہے۔ 'اسر' اور 'ایل'۔ 'اسر' کے معنی ان کی تحقیق میں بندہ کے ہیں اور ایل عبرانی میں اللہ کے معنی کے لیے مشہور ہی ہے۔ اس طرح مولانا کے نزدیک اسرائیل کے معنی عبد اللہ یعنی اللہ کا بندہ کے ہوئے۔

یہود نے اسرائیل کی وجہ تسمیہ معین کرنے میں جس قسم کی ذہانت دکھائی ہے اسی قسم کی ذہانت انھوں نے یعقوبؑ کی وجہ تسمیہ معین کرنے میں بھی دکھائی ہے۔ ان کے نزدیک یعقوبؑ کا نام یعقوب اس لیے ہوا کہ وہ اپنے بھائی عیسو کی ایڑیاں پکڑے ہوئے پیدا ہوئے۔ استاذ امام کے نزدیک اس کی توجیہ بھی یہود کی توجیہ سے بالکل مختلف ہے۔ وہ قرآن مجید کے اشارات کی روشنی میں حضرت یعقوبؑ کے یعقوب نام پانے کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت اسحاقؑ کے بعد ان کے پیدا ہونے کی بشارت بھی اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سنا دی تھی۔

اُذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ : اذکروا، یاد کرو۔ یہ بنی اسرائیل کو دعوت باندازِ ملامت ہے یعنی یاد کرو اس لیے کہ تم بالکل بھول بیٹھے ہو اور جو فضل میں نے تم پر کیے تھے ان کو تم نے اپنے استحقاق ذاتی و خاندانی کا ثمرہ سمجھ لیا۔

'نعمت' کی وضاحت

نعمت سے یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے جن افضال و عنایات کی طرف اشارہ فرمایا ہے قرآن مجید میں جگہ جگہ ان کی تفصیل بھی فرما دی ہے۔ ہم چند آیتیں یہاں نقل کرتے ہیں، ان سے اس اجمال کی وضاحت ہو جائے گی۔

اسی سورہ کے آگے والے رکوع میں فرمایا ہے :۔

یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ وَ اَنِّیۡ فَضَّلۡتُکُمۡ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ (۴۷۔ بقرہ)	اے بنی اسرائیل میرے اس انعام کو یاد کرو جو میں نے تم پر کیا اور میں نے تم کو دنیا والوں پر فضیلت دی۔

اس آیت میں اس انعام کا حوالہ دیا گیا ہے جو بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کی سیادت و امامت کی

صورت میں عطا فرمایا تھا۔

پھر سورہ مائدہ میں فرمایا ہے:۔

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ	اور یاد کرو اپنے اوپر اللہ کے انعام کو اور اس
الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ (۷۔ مائدہ ۵)	کے اس عہد کو جو اس نے تمہارے ساتھ ٹھہرایا۔

اس آیت میں اس انعام کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر ان کو اپنی شریعت دے کر فرمایا۔ یہ شریعت اللہ تعالیٰ اور ان کے درمیان ایک میثاق اور معاہدے کی حیثیت رکھتی تھی، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے اپنی شریعت کی پابندی کا عہد لیا اور اس پابندی کے صلہ میں اپنی طرف سے ان کے لیے دنیا و آخرت کی فوز و فلاح کی ضمانت دی۔

پھر اسی مائدہ میں آگے چل کر اس انعام کی مزید وضاحت ان لفظوں میں فرماتی ہے:۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا	اور یاد کرو جب کہ موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اے
نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ	میری قوم کے لوگو! اپنے اوپر اللہ کے انعام کو یاد
اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖ وَّاٰتٰىكُمْ	رکھو کہ اس نے تمہارے اندر انبیا اٹھائے، تم میں
مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ۔	بادشاہ بنائے اور تم کو وہ کچھ بخشا جو تم سے پہلے
(۲۰۔ مائدہ ۵)	دنیا میں کسی قوم کو نہیں دیا۔

ان آیات سے اس اجمال کی پوری وضاحت ہو جاتی ہے جو زیر بحث آیت میں ہے۔ مزید جو چیز اس آیت میں پیش نظر رکھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ اول تو فرمایا کہ میرا انعام اور پھر اس پر مزید اضافہ یہ فرمایا کہ جو میں نے تم پر انعام کیا، یہ تاکید اس لیے ہے کہ بنی اسرائیل کی تمام گمراہیوں کی جڑ، جیسا کہ آگے چل کر واضح ہوگا، یہی چیز تھی کہ ان کو جو بڑائیاں محض اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے حاصل ہوئیں ان کو انھوں نے اپنی اہلیت و استحقاق کا کرشمہ اور اپنے نسل و نسب کا ایک قدرتی حق سمجھ لیا۔ یہاں نِعْمَتِيَ اور اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ کے الفاظ سے ان کی اسی ذہنیت کی اصلاح مقصود ہے اور آگے یہ چیز بالتدریج کھلتی جائے گی۔

عہد سے مراد ۔ بنی اسرائیل سے آنحضرت صلعم کے متعلق عہد

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ: عہد سے مراد یوں تو پوری شریعت ہی ہے اس لیے کہ شریعت درحقیقت بندوں اور خدا کے درمیان ایک معاہدہ کی حیثیت رکھتی ہے اور یہ معاہدہ اللہ تعالیٰ کا ایک بہت بڑا انعام ہوتا ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ تمام آسمان و زمین کا خالق و مالک ہے کسی کی بھی یہ شان نہیں ہے کہ تمام آسمان و زمین کا بادشاہ اس سے کوئی معاہدہ کرے، اس کے باوجود اگر وہ کسی کے ساتھ معاہدہ کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنی طرف سے اس کو ایک بہت بڑا شرف بخشتا ہے۔ لیکن یہاں اس عام معاہدہ کے ساتھ ساتھ اس خاص عہد کی طرف اشارہ ہے جو بنی اسرائیل سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق لیا گیا تھا۔ اس عہد کا ذکر تورات میں بھی ہے اور اس کی طرف قرآن میں بھی اشارات کیے گئے ہیں۔ کتاب استثنا ۱۵، ۱۹ میں ہے:۔